﴿ وَأَمَّا الَّذِينَ سُعِدُوا فَفِي الْجَنَّةِ ﴾ (سورة هود:۱۰۸)
(اور رہے وہ لوگ جو نیک بخت بنائے گئے، وہ بہشت میں
جائیں گے۔)(ہدایت القرآن)

میرے محسن میرے مرشد

محدثِ کبیر، مفسرِ عظیم، فقیہ النفس، شارح علوم ولی اللہی، امین فیوض قاسم ورشید ومحمود، قابل فخر ترجمان مسلکِ علماء دیوبند، استاذ محترم حضرت اقدس مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری رحمۃ اللہ علیہ سابق شیخ الحدیث وصدر المدرسین دار العلوم دیوبند کی راقم پر پدرانہ شفقتوں، عنایتوں اور آپ کی بافیض علمی وروحانی مجالس کے گلہائے رنگارنگ کا حسین وجمیل گلدستہ۔

مؤلف

مفتی محمد مرشد قاسمی

استاذ الجامعۃ الاسلامیۃ مسیح العلوم، بنگلور

مکتبہ حجاز دیوبند

﴿وَأَمَّا الَّذِيْنَ سُعِدُوْا فَفِي الْجَنَّةِ﴾ [هود:۱۰۸]

اور رہے وہ لوگ جو نیک بخت بنائے گئے، وہ بہشت

میں جائیں گے۔ (ہدایت القرآن)

میرے محسن میرے مرشد

محدثِ کبیر، مفسرِ عظیم، فقیہ النفس، شارحِ علومِ ولی اللہی، امینِ فیوضِ قاسم ورشید ومحمود، قابلِ فخر ترجمانِ مسلکِ علماءِ دیوبند، استاذِ محترم حضرت اقدس مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری رحمۃ اللہ علیہ (سابق شیخ الحدیث وصدر المدرسین دار العلوم دیوبند) کی راقم پر پدرانہ شفقتوں، عنایتوں اور آپ کی بافیض علمی وروحانی مجالس کے گلہائے رنگا رنگ کا حسین وجمیل گلدستہ۔

مؤلف

مفتی محمد مرشد قاسمی

استاذ جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم، بنگلور

MERE MUHSIN , MERE MURSHID

By: Mufti Mohammad Murshid Qasmi

نام کتاب : میرے محسن میرے مرشد

نام مؤلف : مفتی محمد مرشد قاسمی (استاذ جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم، بنگلور)

صفحات : ۱۵۳

ناشر : مکتبہ حجاز دیوبند

تاریخ طباعت : ذی الحجہ ۱۴۴۱ھ = اگست ۲۰۲۰ء

موبائل نمبر : +91 8884293495

ای - میل : maaqasmi87@gmail.com

فہرس

انتساب

میں اپنی اس سعادت مندانہ تحریر کو اولاً: اپنے محسن ومرشد صاحبِ تذکرہ: حضرت الاستاذ حضرت اقدس مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری رحمہ اللہ (سابق شیخ الحدیث وصدر المدرسین دارالعلوم دیوبند) ہی کی روح کے نام کرتا ہوں، جنھوں نے حقیقی والد سے بھی زیادہ احقر کو بنانے اور سنوارنے کی فکر کی، جنھوں نے اس ناکارے کی ہر پریشانی کو اپنی پریشانی اور ہر غم کو اپنا غم سمجھا اور نہ صرف یہ کہ سمجھا؛ بل کہ فوراً اُس کے اِزالے کی فکر فرمائی، جنھوں نے حقیقی والد کے ہوتے ہوئے بھی اور اُن کی وفات کے بعد بھی ایسی پدرانہ شفقتوں سے نوازا کہ آج جسم کا رُواں رُواں اُن کے لیے دعا گو ہے اور ان شفقتوں سے محرومی پر آنکھیں اَشک بار ہیں۔

ثانیاً: اس بوڑھی ماں کے نام، جن کی ہمہ وقت دعائیں مسافرت کی کٹھن زندگی کو ہر لحاظ سے آسان بنائے ہوئے ہے، اللہ پاک سے دعا ہے کہ حقیقی وروحانی؛ دونوں طرح کے والد کے سائے کے سر سے اٹھ جانے کے بعد اب والدہ محترمہ کا سایہ تادیر عافیت کے ساتھ قائم ودائم رہے اور ان کی دعاؤں کی برکت سے ہر گتھی سلجھتی رہے۔ (آمین)

بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم

تاثرات

بے مثال ادیب، یکتائے زمانہ انشا پرداز، بے باک ویگانۂ روزگار مبصر، عظیم اسلامی مفکر، منفرد مربی،

استاذِ گرامی قدر حضرت مولانا **نورِ عالم خلیل صاحب امینی** زید مجدہ

(استاذ ادبِ عربی و چیف اڈیٹر ''الداعی'' دارالعلوم دیوبند)

مولانا مفتی محمد مرشد قاسمی (استاذ جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم بنگلور)، ذی استعداد فاضلِ دارالعلوم دیوبند ہیں۔ طالبِ علمی کے زمانے میں اُنھیں حضرت مولانا مفتی سعید احمد پالن پوری رحمۃ اللہ علیہ (شیخ الحدیث وصدر مدرس دارالعلوم دیوبند) سے خصوصی تعلق رہا، جس کی وجہ سے وہ مفتی صاحب کی نہ صرف شفقتوں سے بہرہ یاب رہے؛ بل کہ اِس کی وجہ سے اُنھیں اپنی استعداد سازی اور اپنے کو میدانِ عمل میں کارآمد اور ہنر مند بنانے کا موقع ملا۔

اس مختصر سی کتاب یا رسالے میں، اُنھوں نے مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی عنایتوں اور فیضان بخشیوں کے واقعات، اُن کے سلسلے میں اپنے عقیدت ریز تاثرات، اُن کی مجلسوں میں سنے گئے اُن کے قیمتی علمی، فکری اور دینی ملفوظات، نیز محنتی وسعادت مند طلبہ کی تربیت واستعداد سازی کے لیے اُن کی غیر معمولی فکر مندی و عملی طریقۂ کار وغیرہ کو؛ خوب صورتی، سادگی اور بے تکلفی سے بیان کیا ہے۔

اُنھوں نے جو کچھ لکھا ہے، وہ قاری کے لیے نہ صرف سبق آموز ہے؛ بل کہ اس سے مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی اِنسانیت نوازی، اپنے لائق شاگردوں کے لیے دل سوزی وہم دردی اور اولاد کی طرح اُن کی مادی ومعنوی پرورش کے لیے تدبیر گری، کا بہ خوبی اندازہ ہوتا ہے۔

یہ کوئی ضروری نہیں کہ ایک بڑا عالم، ایک بڑا انسان بھی ہو، یعنی اپنے تلامذہ کو اپنی اولاد ہی کی طرح، کام یاب و بامراد دیکھنا چاہتا ہو، مولانا مرشد قاسمی نے جو تاثرات و واقعات، حضرت مفتی سعید احمد صاحب کے سلسلے میں قلم بند کیے ہیں، اُن سے مفتی صاحب ایک بڑے انسان کے روپ میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ان سے وہ ایک مخلص اور بے لوث استاذ بھی ثابت ہوتے ہیں، رجال سازی کے فن کارمستری بھی نظر آتے ہیں، گویا اُنھوں نے مطبوعہ کتابوں کی طرح چلتی پھرتی کتابوں یعنی اَصحابِ استعداد شاگردوں کی کھیپ بھی تیار کی اور اِس عمل سے اُنھوں نے بھرپور شادکامی محسوس کی۔ اِس کتاب کو پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ جو استاذ جتنا نفع رساں اور فیض بخش ہوتا ہے، وہ اُسی درجے اپنے طلبہ اور فیض یافتوں میں مقبول ومحبوب ہوتا ہے۔ اِس کتاب کی سطر سطر سے جو عقیدت وگرویدگی مترشح ہوتی، ممنونیّت کے جن جذبات کی عکاسی ہوتی ہے، اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ کتاب کا مُصَنِّف کس قدر اپنے شفقت شعار وخلوص پیشہ استاذ کا ممنونِ اِحسان ہے۔

اس کتاب کا مطالعہ نہ صرف طلبہ؛ بل کہ اساتذہ کے لیے بھی مفید ہے کہ دونوں کو اس سے یہ سبق ملے گا کہ طلبہ کو اِطاعت وسعادت کا نمونہ ہونا چاہیے اور اساتذہ کو شفقتِ پدری واِخلاصِ بزرگانہ کی مثال رہنا چاہیے؛ دونوں فریقوں میں جس درجہ مذکورہ صفات کی فراوانی ہوگی، اُسی درجے تعلیم وتعلم کا عمل بارآور ہوگا اور جس درجے اُن کی کم یابی ہوگی، اُسی درجہ یہ عمل غیر مفید اور بے فیض ہوگا۔

چوں کہ اس کتاب کا اندازِ تحریر قصہ گوئی یا حکایت خوانی کا ہے، جو ہر سطح کے لوگوں کے لیے پسندیدہ ہوتا ہے؛ اِس لیے توقع ہے کہ زبان کی سادگی کے باوجود، قارئین کتاب کو ہاتھ میں لینے کے بعد، از اوّل تا آخر پڑھے بغیر اُس کو دست انداز کرنے کا اِرادہ نہیں کرسکیں گے۔

خدائے کریم سے دعا ہے کہ وہ اِس پرخلوص تحریر کو نفع بخش بنائے اور تحریر نگار کو اس کا بہترین بدلہ دے اور صاحبِ تذکرہ کو اپنی جنت میں اعلیٰ مقام عطا کرے۔

نور عالم خلیل امینی　　افریقی منزل قدیم

۱۲ بجے، چہارشنبہ:　　نزدِ چھتہ مسجد

۲/ذی قعدہ ۱۴۴۱ھ = ۲۴/جون ۲۰۲۰ء　　دیوبند، یوپی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تاثرات

ماہرِ فنِ رجال، شارحِ علومِ کشمیری رحمہ اللہ، عالمِ بافیض، محسن وکرم فرما استاذی الجلیل

حضرت اقدس مولانا **مفتی عبداللہ صاحب معروفی** مدظلہ العالی

(استاذ شعبۂ تخصص فی الحدیث دارالعلوم دیوبند)

الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام على سيدنا محمد وعلىٰ آله وصحبه أجمعين، وعلىٰ من تبعه إلى يوم الدين، وبعد:

حضرت الاستاذ، فقیہ النفس، مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری (شیخ الحدیث وصدر المدرسین دار العلوم دیوبند) رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ، کی وفات سے ہزاروں شاگرد، لاکھوں محبین ومتعلقین اور ہمدردانِ ملتِ اسلامیہ ناقابل بیان صدمے سے دوچار ہوئے ہیں، جو جتنا حضرت سے قریب تھا، ان کی افادیت ونافعیت جس پر جس قدر عیاں تھی، اسی قدر وہ اس صدمے سے متأثر ونڈھال ہے، دنیا کے چپے چپے میں جہاں تک دار العلوم دیوبند کا فیض پہنچا ہوا ہے، حضرت رحمہ اللہ کے شاگرد پائے جاتے ہیں، ظاہر ہے کہ جس طرح ہر استاذ اپنے شاگرد کی برابر توجہ مبذول نہیں رکھ پاتا؛ اسی طرح ہر طالبِ علم کا اپنے ہر استاذ سے ربط وتعلق بھی یکساں نہیں ہوتا؛ بل کہ جانبین میں اخلاص اور طلب کی قلت وکثرت، اس تعلق کی قوت اور اس کے مضمرات میں دخیل ہوتی ہے۔

پیشِ نظر تحریر ایک ''حسرت زدہ طالبِ علم کی کہانی'' ہے، جو اپنے ایک ایسے ہی شفیق مربی ومحسن

کی جدائیگی وفراق سے ماہیٔ بے آب ہوگیا ہے، جس نے اسے انگلی پکڑوا کر چلنا سکھایا ہے، ذاتی وگھریلو زندگی سے لے کر علمی واصلاحی زندگی کے ہر موڑ وہر قدم پر مخلصانہ رہبری وخیر خواہی میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا ہے، ایک مدرس کو اپنے طلبہ پر کیسا شفیق ہونا چاہیے؟ طالبِ علم کی ذہنی وفکری نشو ونما کس طرح کرنی چاہیے؟ الجھی ہوئی گتھیوں کے سلجھانے کا سلیقہ اُسے کیسے سکھایا جاسکتا ہے؟ رسمی دورِ طالبِ علمی کے بعد بھی شاگرد سے تعلق مضبوط سے مضبوط تر کیسے بنایا جاسکتا ہے؟ گھر کے ایک ذمے دار کو اپنے ماتحتوں کی تربیت ونگہداشت کس طرح کرنی چاہیے؟ ایک مخدوم کا اپنے خادموں سے کیا برتاؤ ہونا چاہیے؟ ایک مرشد و مصلح کی اپنے مریدین ومسترشدین پر شکرے کی نگاہ کیا چیز ہوتی ہے؟ ایک باکمال مصنف، کوئی اسی وقت ہوسکتا ہے، جب کہ اس کی یکسوئی وتنہائی میں کوئی خلل انداز نہ ہو؛ اس کے باوجود نہ صرف خواص؛ بل کہ عام انسانوں کے حقوق بھی ایک عالم کس طرح ادا کرسکتا ہے؟ حضرت الاستاذ رحمہ اللہ میں یہ سارے کمالات تھے، جن شاگردوں نے حضرت الاستاذ کو صرف دارالحدیث کی حدتک دیکھا ہے، یقیناً یہ سارے پہلو اُن پر مخفی ہوں گے، پیشِ نظر تحریر اُن تمام پہلوؤں کو کما حقہ اگرا جاگر نہیں کرسکی، تو ان کی ایک جھلک دکھانے میں یقیناً کام یاب ہے اور حضرت الاستاذ رحمہ اللہ سے شاگردی کی جس کو بھی کچھ نسبت حاصل ہے، اسے یہ تحریر ضرور پڑھنی چاہیے۔

ناچیز راقم الحروف کو بھی اپنے لاابالی پنے کے باوجود کسی نہ کسی درجے میں کفش برداری کا شرف حاصل ہے، اِس کے ساتھ حضرت الاستاذ رحمہ اللہ کا معاملہ انتہائی شفیقانہ تھا، رسمی دورِ طالبِ علمی کے بعد بھی شاگرد سے تعلق مضبوط سے مضبوط تر کیسے بنایا جاسکتا ہے؟ حضرت الاستاذ رحمہ اللہ کے حوالے سے اپنا واقعہ بھی بیان کردینا شاید ناظرین کو بارِ خاطر نہ ہو، ۱۹۸۷ء میں افتا سے فراغت کے بعد راقم الحروف کو حضرت الاستاذ مولانا ریاست علی صاحب بجنوری رحمہ اللہ نے ''مدرسہ مطلع العلوم'' شہر: ''رام پور'' بھیج دیا، دوپہر کی سخت گرمی میں بندہ درسگاہ میں بیٹھا مطالعہ کررہا تھا کہ اچانک حضرت الاستاذ کا نیر تاباں طلوع ہوتا ہوا نظر آیا، حیرت کی انتہا نہ رہی، پاؤں زمین پر نہیں پڑ رہے تھے، اس وقت کی خوشی کو بندہ تعبیر نہیں کرسکتا، کہنے کی بات یہ ہے کہ ''فتاویٰ عالم گیری'' میں ایک جزئیہ تلاش کررہا تھا،

جونہیں مل رہا تھا، حضرت سے عرض کیا اور فوراً حضرت نے نکال کر دکھا دیا۔

وہاں کے حالات کچھ ایسے ہوئے کہ چھ ماہ سے زیادہ ٹھہر نہیں سکا اور درمیان میں ہی احقر کو وطن جانا پڑ گیا، حضرت کو کسی طرح علم ہوا ہوگا، اسی سال شعبان میں ''مدرسہ تعلیم الدین، مئو'' کے سالانہ جلسے میں شرکت اور ''بخاری شریف'' کا آخری درس دینے کے لیے حضرت الاستاذ کی آمد ہوئی، ملاقات پر ''رام پور'' چھوڑنے کی وجہ حضرت نے پوچھی احقر نے بتادی، اس سے زیادہ اس حوالے سے کوئی گفتگو نہیں ہوئی، بعد میں ''مئو'' کے ہمارے ایک دوست مفتی منور علی صاحب زید مجدہٗ نے بتایا کہ حضرت مفتی ابوالقاسم صاحب نعمانی مدظلہٗ (شیخ الحدیث وصدر مدرس جامعہ اسلامیہ ریوڑی تالاب بنارس، حال مہتمم دارالعلوم دیوبند جو اسی جلسے میں شرکت کی غرض سے تشریف لائے تھے) اور حضرت الاستاذ علیہ الرحمۃ کے درمیان تمھارے متعلق خاصی گفتگو ہوئی ہے، نہ جانے حضرت الاستاذ رحمہ اللہ نے ان سے کیا کہا ہوگا کہ رمضان المبارک ہی میں ناچیز کے نام بہ ذریعہ ڈاک ''جامعہ اسلامیہ، بنارس'' سے تقرر نامہ موصول ہوگیا، اس طرح حضرت الاستاذ کی غیر معمولی توجہ وشفقت سے حضرت مفتی ابوالقاسم نعمانی صاحب مدظلہٗ کے زیرِ سائے بہت کچھ کام کرنے کا موقع فراہم ہوا، ان سطور کو لکھتے ہوئے حضرت الاستاذ کی یاد نے ایک بار پھر بے قابو کر دیا ہے، الٰہی حضرت الاستاذ کے مراتب بلند سے بلند تر فرما اور ان کے احسانات کا اپنی شایانِ شان بدلہ عطا فرما، بندہ راقم الحروف اس وقت اپنی عدیم الفرصتی کی وجہ سے حضرت الاستاذ رحمہ اللہ پر کوئی مستقل تحریر مرتب نہیں کر سکا، بس اسی پر اکتفا کرتا ہے،

ع:

گفتگو آئین درویشی نہ بود ورنہ با تو ماجراہا داشتیم

حضرت الاستاذ کے حوالے سے جو کچھ پیشِ نظر کتاب میں لکھا گیا ہے، چوں کہ خود بندہ راقم الحروف کے ساتھ بھی حضرت الاستاذ کا برتاؤ اسی طرح کا رہا ہے؛ اس لیے اس ناچیز کو عزیزم مفتی محمد مرشد سلمہ اللہ کی اس تحریر میں کوئی مبالغہ آرائی نظر نہیں آتی۔

ان شاء اللہ نوجوان فضلائے دارالعلوم اور تدریس یا کسی بھی دینی وعلمی کام سے متعلق نوفارغ التحصیل یا کم تجربہ کار حضرات کے حق میں امید ہے کہ یہ تحریر نفع بخش ثابت ہوگی، اللہ تعالیٰ اس کتاب کو قبولیت سے سرفراز فرمائے اور مؤلف سلمہ اللہ کو مزید علمی خدمات انجام دینے کی توفیق مرحمت فرمائے اور شرور وفتن سے محفوظ رکھے، آمین۔

عبداللہ معروفی

دارالعلوم دیوبند

۵/ ذی قعدہ ۱۴۴۱ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تاثرات

معدنِ حسنات، عالمِ ربانی، محدث وفقیہ، محسنی ومجی

حضرت اقدس مولانا **مفتی محمد شعیب اللہ خان صاحب مفتاحی** دام اقبالہ

(بانی و مہتمم جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم، بنگلور)

حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری - رحمۃ اللہ علیہ - محدث دار العلوم دیوبند کی شخصیت ان نادرۂ روزگار اور عبقری ہستیوں میں سے ہے، جن کے بارے میں کہنے والے نے کہا کہ

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ وَر پیدا

اور

بڑی مدتوں میں ساقی بھیجتا ہے ایسا فرزانہ
بدل دیتا ہے جو بگڑا ہوا دستورِ مے خانہ

خالق کائنات کے جاری کردہ نظام کے تحت ہر روز دنیا میں کچھ لوگ آتے ہیں، تو کچھ یہاں سے کوچ کرتے ہیں اور یہ سلسلہ صدیوں سے بلا تخلف جاری ہے؛ لیکن یہ بھی ایک نا قابلِ انکار حقیقت ہے کہ یہاں آنے اور جانے والے سب لوگ یکساں نہیں ہوتے؛ بل کہ اُن میں بڑا اور کبھی بہت بڑا فرق ہوتا ہے، کہ بعض آنے والے آتے اور چلے جاتے ہیں؛ مگر نہ اُن کے آنے کا اثر ہوتا ہے اور نہ اُن کے جانے سے کوئی فرق پڑتا ہے اور بعض حضرات آتے ہیں، تو اُن کا آنا بڑا مبارک ہوتا ہے، یہاں تک کہ جب وہ یہاں سے جاتے ہیں، تو ان کے فیوض و برکات کا ایک بیش بہا ذخیرہ اور اپنے علوم وافکار کا ایک عظیم دفتر اپنے بعد والوں کے لیے چھوڑ جاتے ہیں، جو صدیوں تک انسانوں کی ہدایت

ورہبری اور آدمی گری ومردم سازی کا کام انجام دیتے ہیں اور اس لیے جب وہ جاتے ہیں، تو نہ صرف انسان روتے ہیں؛ بل کہ ان کے لیے زمین بھی روتی ہے اور آسمان بھی گریہ کرتا ہے۔

حضرت اقدس مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری رحمہ اللہ کا شمار ایسے ہی با کمال وبا فیض ہستیوں میں ہوتا ہے، جن کی زندگیوں کا ہر ہر پہلو دوسروں کے لیے علم واخلاق کا درس، رشد وہدایت کا سامان، عبرت وموعظت کا پیغام اور زندگی گزارنے کے لیے بہترین نمونہ ہوا کرتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ امت میں ہر دور میں اربابِ علم وفن اور اصحابِ طریقت ومعرفت کے تذکرے لکھنے اور ان کے احوال جمع کرنے اور ان سے استفادے کا غیر مختتم سلسلہ جاری ہے۔

زیر نظر تحریر بعنوان: ''میرے محسن میرے مرشد'' بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے، جس میں حضرت والا کے کچھ احوال، کچھ اقوال، کچھ نصائح، کچھ تعلیمات، کچھ واقعات اور حالات کو جمع کیا گیا ہے۔

یہ تحریر جامعہ مسیح العلوم، بنگلور کے لائق وفائق استاذ: مولانا مفتی محمد مرشد صاحب زید مجدہم نے ان کے علم میں موجود ذخیرے میں سے نکال کر جمع کیا ہے اور ان کو حق بھی تھا کہ وہ یہ کام انجام دیتے؛ کیوں کہ اُن کو حضرت مفتی صاحب سے جہاں تلمیذانہ تعلق تھا، وہیں ان کو مسترشدانہ تعلق بھی حاصل تھا۔

احقر نے مختلف مقامات سے اس تحریر کو دیکھا اور اندازہ ہوا کہ بڑی کام کی باتیں اس میں جمع ہوگئیں ہیں، جو ایک جانب علما اور طلبہ کے لیے بڑی نافع ہیں، تو دوسری جانب عوام کے لیے بھی ان میں درس نصیحت وعبرت موجود ہے، کیوں نہ ہو؟ جب کہ یہ ایسی شخصیت کے اقوال اور احوال اور ہدایات وتعلیمات ہیں، جن کا علم وتفقہ مسلَّم تھا، جن کا عمل وکردار بے داغ تھا، جن کا صلاح وتقویٰ معروف تھا، جن کی باتیں پیغام ہدایت، جن کی نصیحت موجبِ عبرت، جن کا درس قابلِ تعریف تھا۔

امید ہے کہ حضرت کے متعلقین بالخصوص اور تمام اہلِ اسلام بالعموم اس تحریر سے استفادہ کریں گے، اخیر میں میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ اس تحریر کو زیادہ سے زیادہ نافع بنائے اور لوگوں کو استفادے کی توفیق عطا فرمائے۔

فقط

محمد شعیب اللہ خان

(مہتمم جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم، بنگلور)

۱۹/ ذی قعدہ ۱۴۴۱ھ = ۱۱/ جولائی ۲۰۲۰ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تاثرات

صاحبِ فقہ وفتاویٰ، حاملِ علم وتواضع، محسنی ومجی

حضرت اقدس مولانا **مفتی محمد نعمان صاحب سیتاپوری** دامت برکاتہم

(معین مفتی دارالعلوم دیوبند)

الحمد لله رب العالمين، والصلاة والسلام على رسوله الكريم، مُحَمَّد وآله وأصحابه أجمعين، أما بعد!

خداوندقدوس نے محض اپنے فضل وکرم سے احقر کو سن شعور وآگاہی سے اب تک جن چند عظیم شخصیات سے استفادے کا موقع عطا فرمایا ہے، اُن میں ایک، مفسر قرآن، محدث کبیر، شارحِ علوم ولی اللہی ونانوتوی، حضرت الاستاذ حضرت اقدس مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری نوراللہ مرقدہ (سابق شیخ الحدیث وصدرالمدرسین دارالعلوم دیوبند) کی شخصیت ہے۔

حضرت والا کی ذات گرامی سے ناچیز کو علم وتربیت اور مختلف شعبہائے زندگی میں **الحمد للہ** خوب استفادے کا موقع حاصل ہوا۔ راقم الحروف کا حضرت والا سے استفادے کا سلسلہ، مکمل سولہ (۱۶) سال پر محیط ہے، اس دوران حضرت والا نے احقر کو اسباق، تقاریر اور عمومی وخصوصی مجالس وغیرہ میں بے شمار قیمتی اصول ونکات اور تجربات سے مستفید فرمایا اور ایک مشفق باپ کی حیثیت سے ناچیز پر بے پناہ شفقتیں فرمائیں اور بہترین استاذ ومربی کی حیثیت سے ناچیز کی تربیت اور اصلاح میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں فرمایا۔

اور حضرت کی شفقتیں و محبتیں صرف احقر کو حاصل نہیں ہوئیں؛ بلکہ احقر کی اولاد کو بھی ان کا ایک بڑا حصہ حاصل ہوا، حضرت والا کا عام معمول تھا کہ فون پر یا حاضری پر ناچیز کی خیریت کے ساتھ بچیوں کی بھی خیریت معلوم فرماتے اور ان کی تعلیم وغیرہ سے متعلق سوال فرماتے۔ اور اگر ناچیز کی یا اہلیہ کی کوئی کوتاہی ظاہر ہوتی تو ڈانٹ بھی پڑتی۔ ایک مرتبہ راقم الحروف نے دارالافتا کی مصروفیت کا عذر کیا تو حضرت والا نے فرمایا: ''تو ہی اگر نہ چاہے تو بہانے ہزار ہیں''۔

اور ان سب کا نتیجہ یہ ہوا کہ دن بہ دن احقر کے دل میں حضرت والا کی محبت بڑھتی گئی اور ناچیز حضرت والا سے اس قدر قریب ہوگیا کہ حضرت والا سے کسی بھی علمی مسئلے میں کھل کر گفتگو اور مذاکرہ کرنے میں کوئی رکاوٹ نہ ہوتی تھی اور حضرت والا بڑی محبت کے ساتھ احقر کی گفتگو سماعت فرماتے اور بہترین جواب عنایت فرماتے۔ اور حضرت کی شفقت و محبت کی حد یہ ہوئی کہ راقم الحروف کسی بھی وقت حضرت والا کی خدمت میں حاضر ہوسکتا تھا، حضرت کی طرف سے مکمل اجازت تھی، عصر بعد وغیرہ کی کوئی قید نہیں تھی۔

اور اگر کبھی حاضری میں پانچ، چھ دن گذر جاتے اور غفلت کی وجہ سے فون بھی نہیں پہنچتا تو خود حضرت اقدس کا خیریت کے لیے فون آجاتا کہ ''کیوں؟ کیا حال ہے؟ کوئی پریشانی تو نہیں؟ طبیعت وغیرہ ٹھیک ہے؟'' اور اگر راقم الحروف عرض کرتا کہ کام کی کثرت کی وجہ سے حاضر نہیں ہوسکا، میں ابھی حاضر ہوتا ہوں تو فرماتے: ''صرف خیریت کے لیے فون کیا تھا، کسی کام سے نہیں، ابھی آنے کی ضرورت نہیں، جب سہولت ہو، تب آؤ''۔

اور حضرت والا جب ملک یا بیرون ملک لمبے سفر پر ہوتے تو فون کے ذریعے رابطہ رہتا، ابھی انتقال سے پہلے جب آپ علاج کی غرض سے ممبئی تشریف لے گئے تو کئی مرتبہ فون پر بات ہوئی اور مختلف مسائل پر مذاکرہ ہوا۔ اسی دوران ایک مرتبہ حضرت والا نے ناچیز کی کسی بات سے خوش ہوکر بہت دعائیں دیں، ناچیز نے عرض کیا: حضرت! یہ سب آپ کی کیمیا اثر صحبت کا نتیجہ ہے۔ حضرت نے فرمایا: ''نہیں، نہیں، یہ سب اللہ کا فضل ہے''۔ احقر نے عرض کیا: حقیقت میں تو اللہ تعالی ہی کا

فضل ہے؛لیکن دنیا جو دارالاسباب ہے،اس میں اللہ تعالی نے آپ کوسبب وذریعہ بنایا ہے۔حضرت نے فرمایا:''یہ تو ہوتا ہے(کہ دنیا میں کوئی،سبب وذریعہ ہوتا ہے)''۔

راقم الحروف کو اللہ تعالی نے بعض اکابر (اکابر ہردوئی) کی خصوصی توجہات اور دعاؤں کی برکت سے بچپن ہی سے پڑھنے کا شوق عطا فرمایا تھا،جس کے نتیجے میں احقر کو فارسی جماعت سے دورہ حدیث شریف، تکمیل افتا اور تدریب افتا تک تعلیم میں انتھک محنت کی توفیق ہوئی اورتقریباً ہر امتحان میں اول یا دوم پوزیشن سے کامیابی حاصل ہوتی رہی **فالحمد للّٰہ علی ذلک** ؛لیکن دیوبند آنے کے بعد ناچیز کو کسی ایسے علمی سرپرست کی ضرورت برابر محسوس ہوتی رہی،جن کےعلم وفہم اورتقوی وطہارت سے طبیعت مطمئن ہواوران سے قریب ہوکراوران کی خدمت وصحبت میں رہ کر بھرپوراستفادہ کیا جائے۔

دار العلوم میں جب احقر دورہ حدیث شریف میں داخل ہوا تو ترمذی شریف کے درس میں شریک ہوکرحضرت اقدس کی اعلی درجے کی درایت،نصوص فہمی کی معتدل اور بہترین صلاحیت، علمی گہرائی وگیرائی اورافہام وتفہیم کے کامیاب ترین ملکہ وغیرہ نے ناچیز کوحضرت والا کا گرویدہ بنادیا، جس کی بنا پر چند ہی دنوں میں طے کرلیا گیا کہ اب حضرت کا دامن تھامنا ہے اور مضبوطی سے تھامنا ہے۔پھرعصر بعد کی مجلس میں حاضری کا سلسلہ شروع کیا گیا،جس میں احقر حضرت والا سے مختلف سوالات کرتا اورحضرت والا جواب عنایت فرماتے۔یہ سلسلہ چلتا رہا،ایک دن ناچیز نے ہمت کرکے عرض کیا کہ حضرت! گھر وغیرہ کی کوئی بھی خدمت احقر کے لائق ہوتو حکم فرمائیں۔حضرت نے فرمایا: ''مجھے کسی خدمت کی ضرورت نہیں اور گھر کا سارا سامان ہمارے بچے لے آتے ہیں''۔اور یہ زمانہ حضرت والا کے رعب وجلال کے عروج کا تھا،کچھ بھی عرض کرنے میں زبان لڑکھڑاتی تھی۔

❖ ایک دن راقم الحروف نے عرض کیا کہ عصر بعد کے علاوہ دوسرے وقت حاضر ہوسکتا ہوں؟ حضرت نے فرمایا:''طلبہ کے لیے میں نے عصر بعد کا وقت رکھا ہے،دوسرا کوئی وقت خالی نہیں''۔

بہرحال ناچیز اسی طرح عصر بعد کی مجلس میں حاضر ہوکر علمی سوالات کرتا رہا اور رشدہ شدہ حضرت کی توجہ ناچیز کی طرف بڑھنے لگی، اور جب ذی قعدہ (سنہ: ۱۴۲۵ھ) کے دوسرے عشرے کے اخیر میں یا تیسرے کے اوائل میں حضرت والا نے اپنے گھنٹے میں ترمذی شریف کی عبارت خوانی کے لیے خواہش مند طلبہ کا اپنے گھر پر انٹرویو لیا تو منتخب شدہ طلبہ میں راقم الحروف کا بھی نام آ گیا **فالحمد للّٰہ علی ذلک**، اور اس طرح عبارت خوانی کے ذریعے توجہ اور شناسائی میں مزید اضافہ ہوا؛

❖ لیکن ابھی یہ سب ابتدائی مراحل میں تھا کہ بقرعید کی چھٹیاں قریب آ گئیں، احقر نے طے کیا کہ یہ دورے کا سال ہے اور حدیث شریف پر خوب محنت کرنی ہے؛ لہٰذا چھٹیوں میں گھر نہیں جانا ہے؛ چناں چہ احقر نے دار العلوم میں رہ کر اور رات دن ایک کر کے خوب محنت ومطالعہ کیا۔ یہ راقم الحروف کی پہلی عید تھی، جو والدین اور بھائی، بہنوں سے دور، مدرسہ میں گذر رہی تھی اور عجیب اتفاق کہ راقم الحروف کو کچھ بنانا بھی نہیں آتا تھا؛ اس لیے دار العلوم سے جو کھانا ملتا، اسی پر اکتفا کیا جاتا؛ البتہ کمرے کے پڑوس میں ایک طالب علم تھے، جو مختلف علمی چیزوں میں احقر سے رجوع کرتے رہتے تھے، انہوں نے بقرعید کے دن دعوت کردی تھی۔ بقرعید کی چھٹیاں گذرنے کے بعد راقم الحروف بعض احباب کی کرم فرمائی سے کچھ تکلیف دہ عوارض کا شکار ہوگیا، اتفاق سے اس کا تذکرہ حضرت والا سے کیا گیا، حضرت نے شفقت کا معاملہ فرمایا۔ اور یہ بھی حضرت سے قریب ہونے کا ذریعہ ہوا۔

حضرت والا گاہے گاہے احقر کا حال دریافت فرماتے رہتے تھے۔ ایک مرتبہ حضرت والا نے ناچیز کا نام دریافت فرمایا، احقر نے اپنا نام بتایا۔ چند دنوں بعد فرمانے لگے: ''بھئی! تیرا کیا نام ہے؟ میں تو بھول گیا''، پھر ناچیز نے نام بتایا۔ پھر چند دنوں بعد حضرت والا نے فرمایا: ''بھئی! تیرا کیا نام ہے؟ میں تو بھول گیا''۔ اس طرح کئی مرتبہ ہوا، اس کے بعد حضرت والا کو احقر کا نام ایسا یاد ہوا کہ بھولنے کا سوال ختم ہوگیا۔

بہرحال دورہ حدیث شریف سے فارغ ہوتے ہوتے حضرت والا سے اتنا تعلق ہوگیا تھا کہ

حضرت نام اور چہرہ کے ساتھ اچھی طرح پہنچانتے تھے؛ لیکن عصر بعد کی مجلس کے علاوہ کوئی خاص تعلق نہیں ہوا تھا۔

❖ پھر جب ذی قعدہ، سنہ: ۱۴۲۶ھ میں راقم الحروف تکمیل افتا میں داخل ہوا تو ۲۴/ذی الحجہ (مطابق: ۲۵/جنوری، سنہ: ۲۰۰۷ء، بہ روز: چہارشنبہ) کو عصر بعد کی مجلس میں حضرت والا نے ''اِعلاء السنن'' کی کوئی جلد الماری سے نکالنے کا حکم فرمایا اور اس وقت آپ نے دیکھا کہ ہر جلد کے پشتہ پر آپ نے اس جلد کی کتب کے جو نام لکھ رکھے تھے، وہ مٹ رہے ہیں، حضرت والا نے ناچیز فرمایا: ''کل چھٹی ہے؛ لہٰذا صبح آ کر ہر جلد کے پشتے پر کتابوں کے نام لکھ دو''۔ راقم الحروف کو بہت خوشی ہوئی؛ چناں چہ احقر ۲۶/جنوری کی صبح حضرت والا کی خدمت میں حاضر ہوا اور حضرت والا کے حکم کی تعمیل کی۔ اس دوران حضرت مکمل لکھنے میں مصروف رہے؛ البتہ درمیان میں ایک مرتبہ چائے آئی، حضرت والا نے راقم الحروف کو بھی چائے پلائی اور کچھ وقفے کے بعد درج ذیل ملفوظ سے مستفیض فرمایا، جو احقر نے کسی کاغذ پر لکھ کر محفوظ کر لیا تھا اور دار العلوم پہنچ کر ڈائری میں صاف کر لیا تھا، اِس وقت ڈائری سامنے رکھ کر نقل کر رہا ہوں:

> بھائی نعمان! علم بہ ذات خود مقصود ہے، علم برائے مال مقصود نہیں، (یعنی:) علم برائے تنخواہ مقصود نہیں، تنخواہ تو مجبوراً لینی پڑتی ہے؛ ورنہ آدمی علم کیسے پڑھے گا؟ میں شروع میں تنخواہ لیتا تھا اور اُس سے بھی گذارہ نہیں ہوتا تھا، فیملی بڑی تھی؛ مگر جب اللہ نے وسعت دی تو میں نے تنخواہ لینی بند کر دی۔ دنیا کا علم تو برائے مال ہے اور برائے تنخواہ مقصود ہے، اگر دنیا کے علم سے واجبی مال نہ ملے تو تُف ہے اُس علم پر۔ اور عالم کو دین کے علم پر اگر کچھ بھی نہ ملے تو بھی وہ کام یاب ہے۔ یہ نکتہ ابنائے زماں اگر سمجھ لیں تو ہر عالم علامۃ الدھر بن جائے۔ آج کل کے علما کے نزدیک علم برائے مال مقصود ہو گیا ہے، وہ خود زبان سے اقرار نہ کریں، مگر ان کا عمل اس کی شہادت دیتا ہے۔

❖ تکمیل افتا کے سال اللہ تعالی نے کاتب السطور کو حضرت والا سے قرآن وحدیث کے علاوہ فقہ وفتاوی کے سلسلہ میں خوب استفادے کا موقع عطا فرمایا، احقر فقہ وفتاوی سے متعلق مختلف سوالات حضرت والا کی خدمت میں پیش کرتا، حضرت والا ان کا جواب مرحمت فرماتے، گاہے گاہے حضرت والا مختلف مسائل یا موضوعات پر احقر کو لکھنے کا حکم فرماتے (جن کی تفصیل طویل ہے) تو احقر وہ مسائل یا مضامین لکھ کر حضرت والا کی خدمت میں پیش کرتا اور حضرت والا احقر کی اصلاح ورہنمائی فرماتے۔

❖ اسی دوران ایک مرتبہ ناچیز نے حضرت والا سے تمرین کی درخواست کی، حضرت نے فرمایا: ''میرے پاس وقت نہیں''۔عرض کیا گیا: صرف عصر بعد ملاحظہ فرمالیا کریں۔فرمایا: ''عصر بعد بھی کام رہتا ہے'' (کیوں کہ اس زمانے میں حضرت والا عصر بعد بھی کافی دیر تک لکھتے رہتے تھے)، عرض کیا گیا: جس دن موقع ہو اور طبیعت میں نشاط ہو، ملاحظہ فرمالیا کریں۔حضرت نے منظور فرمالیا؛ چناں چہ اس طرح احقر نے افتا کی تمرینات کے سلسلے میں بھی حضرت والا سے استفادہ کیا ہے **فالحمد للہ علی ذلک۔**

تمرین چیک کرنے میں حضرت والا کا طریقہ کار یہ تھا کہ آپ سوال وجواب بہ غور ملاحظہ فرماتے، پھر قلم لے کر جواب میں کانٹ چھانٹ اور اصلاح فرماتے، پھر اصلاح کردہ فتوی ناچیز کو واپس فرمادیتے۔اور ناچیز کا کام یہ تھا کہ حضرت جو اصلاحات فرماتے، انھیں بہ غور دیکھتا اور ان سے اصولی رہنمائی حاصل کرتا۔حضرت والا اصلاحات سے متعلق زبان سے کچھ نہیں فرماتے اور یہ فرمایا کرتے کہ ہمارے استاذ: حضرت مفتی سید مہدی حسن صاحب شاہجہاں پوری رحمہ اللہ کا یہی طریقہ تھا۔

اور حضرت والا کا اصول اس سلسلے میں یہ تھا کہ جس غلطی کی اصلاح کی گئی، وہ دوبارہ نہیں ہونی چاہیے؛ ورنہ ڈانٹ پڑتی؛ بلکہ عام سوالات میں بھی راقم الحروف کو صرف اس سوال کی اجازت تھی، جو انتھک محنت اور کوشش سے حل نہ ہو سکے اور کسی مضبوط بنیاد پر ہو۔اگر کبھی اس اصول کی خلاف ورزی ہو جاتی تو ڈانٹ پڑتی، جس سے **الحمد للہ** بہت فائدہ ہوا اور از خود محنت اور غور وفکر کا مضبوط مزاج

پیدا ہوا؛ اسی لیے ناچیز برجستہ ذہن میں آنے والا کوئی سوال، حضرت والا سے نہیں کرتا تھا؛ بلکہ صرف وہ سوال کرتا تھا، جو کسی مضبوط بنیاد پر قائم ہو اور مطالعہ اور غور و فکر سے اس کا حل مشکل ہو۔

اور اگر حضرت والا کا جواب سن کر تشفی نہ ہوتی تو کاتب السطور کا طریقہ کار فوراً اشکال کرنے کا نہیں تھا؛ بلکہ احقر حضرت والے کا جواب ذہن میں محفوظ کر لیتا، پھر اس میں اطمینان کے ساتھ غور کرتا، پھر بھی اگر اشکال باقی رہتا تو دوسرے یا تیسرے دن مضبوط علمی بنیادوں پر ادب و احترام کے ساتھ حضرت والا کی خدمت میں اشکال پیش کرتا، اس طریقہ کار سے حضرت والا بہت خوش ہوتے۔

❖ اس زمانے میں ایک طالب علم تھا، جو اکثر و بیشتر عصر کی نماز حضرت کے محلے کی مسجد میں پڑھتا تھا اور مجلس میں خدمت کے لیے حضرت والا کے پیروں کے پاس پہنچ جاتا تھا، ہم عام طور پر خدمت سے محروم ہی رہتے تھے؛ البتہ کبھی کبھار سر میں تیل لگانے یا سر دبانے کا موقع مل جاتا تھا، اس نے ایک مرتبہ کوئی سوال کیا، سوال کچھ بیجا تھا، حضرت نے فرمایا: ''تو خاموش رہ، (میری طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا) صرف اسی کو سوال کرنے دے''۔

پھر حضرت والا کا معمول یہ ہو گیا کہ راقم الحروف اگر مجلس میں کچھ تاخیر سے پہنچتا تو حضرت والا راقم الحروف کو دیکھ کر فرماتے: ''آگے آجاؤ، آگے آجاؤ''، حضرت والا کا یہ جملہ سن کر قریب بیٹھے طلبہ ناچیز کے لیے جگہ چھوڑ دیتے اور ناچیز حضرت والا کے قریب، تپائی سے متصل جا کر بیٹھتا۔

❖ اسی دوران کچھ عرصہ بعد حضرت والا نے ایک دن آئے ہوئے خطوط دے کر ارشاد فرمایا: ''انھیں پڑھ کر سناؤ''، پھر حضرت والا نے جواب املا فرمایا۔ اس کے بعد ہفتہ، دس دن میں حضرت والا کے پاس جو خطوط جمع ہوتے، آپ احقر کو ان کا جواب املا فرماتے اور بہ ذریعہ ڈاک ان کی روانگی کا کام بھی احقر کے ذمہ ہوتا۔

❖ انھیں ایام میں جب تفسیر ہدایت القرآن کی پانچویں جلد چھپ کر آئی تو حضرت والا نے حسب معمول، اس کا ایک، ایک نسخہ مختلف اہل علم کی خدمت میں بہ طور ہدیہ ارسال فرمایا اور مفسر قرآن حضرت مولانا اخلاق حسین صاحب قاسمی دہلوی رحمہ اللہ کی خدمت میں بھی ارسال فرمایا۔ چند

دنوں بعد انھوں نے انتہائی ضعف و پیرانہ سالی میں جب کہ موصوف کے ہاتھوں میں رعشہ آچکا تھا، جو تبصرہ لکھ کر ارسال فرمایا، اس کی تحریر انتہائی شکستہ تھی، حضرت والا نے وہ تحریر راقم الحروف کی طرف بڑھا کر سنانے کا حکم فرمایا، راقم الحروف نے **الحمد للہ** وہ تحریر پڑھ کر سنادی، اس پر حضرت والا نے فرمایا: ''تو تو مفتی ہوگیا، شکستہ تحریر بھی پڑھ لیتا ہے، مفتی کو ہر طرح کی تحریر پڑھنے کا ملکہ ہونا چاہیے''۔

تبصرے میں ایک اہم جزو یہ بھی تھا کہ سورہ بنی اسرائیل کی آیت: ۶۰ میں جو **الرُّءْيَا** کا لفظ آیا ہے، حضرت والا نے اس کا ترجمہ ''مشاہدہ'' سے کیا تھا، حضرت مولانا اخلاق حسین صاحبؒ نے آپ کے اس ترجمہ کو بہت پسند فرمایا اور یہ تحریر فرمایا: ''آپ کے اس ترجمے سے آپ کی دقت نظر کا اندازہ ہوتا ہے، اوروں نے بھی اس کے ترجمے کیے ہیں؛ مگر آپ کا ترجمہ دقت نظر پر مبنی ہے''۔ حضرت والا نے اس جزو کے جواب میں ''جزاکم اللہ'' کا جملہ املا کرایا تھا۔

پھر جب تکمیل افتا کے سال، سالانہ امتحان قریب آیا تو حضرت والا نے ایک دن ناچیز سے دریافت فرمایا: ''آیندہ کیا ارادہ ہے؟'' عرض کیا گیا: تدریب افتا کا ارادہ ہے! حضرت نے فرمایا: ''بہتر ہے''۔

پھر جب تدریب افتا کے سال، سالانہ امتحان قریب ہوا تو حضرت نے ایک دن قبیل مغرب فرمایا: ''کل صبح فجر کی نماز میری مسجد میں پڑھنا''؛ چناں چہ راقم الحروف فجر میں حضرت والا کی مسجد میں حاضر ہوگیا اور نماز کے بعد حضرت والا کے ساتھ گھر پہنچا، حضرت آرام کے لیے لیٹ گئے اور مجھے سر دبانے کا حکم فرمایا، پھر آپ نے میری تقرری کے لیے ایک اچھی جگہ کا تذکرہ فرمایا، احقر نے عرض کیا: حضرت! میں غور کر کے بتاتا ہوں، حضرت نے فرمایا: ''ٹھیک ہے''۔ ناچیز نے چند دنوں بعد کچھ وجوہ سے معذرت پیش کی، حضرت والا نے خندہ پیشانی سے ناچیز کی معذرت قبول فرمائی اور یہ فرمایا: ''ٹھیک ہے، کوئی اور جگہ دیکھتے ہیں''۔

پھر ایک بڑے مدرسہ میں ایک بڑے مفتی صاحب سے بات کی؛ لیکن وہاں جگہ خالی نہیں تھی،

پھر فرمایا: ''تمھاری نظر میں کوئی جگہ ہو تو بتاؤ، میں وہاں بات کروں''۔ میرے ایک رفیق درس، بنگلور میں جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم کے لیے اصرار کر رہے تھے، احقر نے ذاتی طور پر معلومات حاصل کیں تو طبیعت کا رجحان ہوا، چند دنوں بعد ناچیز نے حضرت والا سے عرض کیا، حضرت نے فرمایا: ''ٹھیک ہے، مفتی شعیب اللہ صاحب کا نمبر لے کر آؤ''، پھر حضرت والا نے حضرت مفتی محمد شعیب اللہ خان صاحب مدظلہ سے خود بات کی اور انھوں نے افتا و تدریس کے لیے راقم الحروف کا تقرر منظور کر لیا اور راقم الحروف نے شوال (سنہ: ۱۴۲۸ھ) میں جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم بنگلور پہنچ کر کام شروع کر دیا اور احقر نے جامعہ ہذا میں کل ساڑھے چار سال (شوال، سنہ: ۱۴۲۸ھ تا ربیع الاول، سنہ: ۱۴۳۳ھ) افتا و تدریس کی خدمت انجام دی۔

جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم، بنگلور میں خدمت کے زمانہ میں بھی ناچیز حضرت والا سے تدریسی و غیر تدریسی مختلف امور میں مشورہ لیتا رہا اور حضرت والا کی ہدایات کے مطابق کام کرتا رہا (جس کی تفصیل طویل ہے اور یہ موقع بھی نہیں)۔

پھر اللہ تعالی نے اپنے فضل و کرم سے راقم الحروف کو مادر علمی دار العلوم دیو بند میں خدمت کا موقع عطا فرمایا۔ دیو بند آ کر حضرت سے استفادہ کی راہیں مزید آسان ہوگئیں اور پھر آٹھ سال سے زیادہ مدت میں حضرت سے خوب استفادے کا موقع ملا، اس کی تفصیل بھی طویل ہے اور یہ موقع بھی نہیں؛ البتہ سر دست حضرت والا کے تعلق سے اختصار کے ساتھ چند اہم باتیں پیش خدمت ہیں:

(۱) حضرت والا کی نصوص فہمی اور عبارت فہمی اس قدر مضبوط تھی کہ آپ کسی آیت کی تفسیر میں یا کسی حدیث کی تشریح میں جو کچھ ارشاد فرماتے، وہ یقین و بصیرت کے ساتھ ارشاد فرماتے، اس میں دور دور تک شک، شبہ اور تردد کا شائبہ تک نہیں ہوتا تھا؛ اس لیے حضرت کی جو بات، ادب و احترام اور عقیدت و محبت کے ساتھ سنی جاتی، وہ سامع کے دل میں جاگزیں ہو جاتی اور عام طور پر وہ سامع کے لیے علم کا ایک باب کھولنے والی ہوتی؛ کیوں کہ اصول تو اصول ہوتا ہی ہے اور ہر جزئی بھی اپنے اندر اصول رکھتی ہے۔ احقر نے حضرت والا کی گفتگو اور تحریرات میں یہ دونوں باتیں بہ طور خاص نوٹ کی

ہیں اور حضرت والا کے اس خاص وصف سے ناچیز کو بے پناہ فائدہ ہوا ہے۔ اللہ تعالی حضرت والا کو بہترین بدلہ عطا فرمائیں۔

(۲) حضرت والا قرآن کی تفسیر میں اور احادیث مبارکہ (**علی صاحبها ألف ألف صلاۃ وسلام**) کی تشریح میں سیاق وسباق سے ہٹ کر، محض الفاظ کی بنیاد پر پیدا کیے جانے والے احتمالات پسند نہیں فرماتے تھے، حضرت والا کا مزاج یہ تھا کہ آپ سیاق وسباق اور دیگر قرائن کی روشنی میں آیت کریمہ کی صحیح مراد اور حدیث پاک کی صحیح تشریح تک پہنچنے کی کوشش فرماتے اور مرجوح یا بے بنیاد احتمالات کو پرے رکھتے۔

(۳) حضرت والا صحیح ومعتبر تاویل کو تو قبول فرماتے تھے؛ لیکن ادھر ادھر کی بیجا تاویلات ہرگز پسند نہیں فرماتے تھے اور نہ انھیں اپنی تقریر وتحریر میں کوئی جگہ دیتے تھے۔

(۴) حضرت والا نصوص فہمی میں جمع اقوال سے زیادہ، درایت وفہم پر زور دیتے تھے، جو اکابرین دیوبند کا بنیادی طریقہ ہے۔ اور فرمایا کرتے: ''حضرت مفتی محمد عزیز الرحمٰن صاحبؒ کے زمانے میں دار الافتا میں صرف شامی اور مزید چند کتابیں تھیں اور آپ سارے فتاوی صرف شامی سے تحریر فرماتے تھے''۔

(۵) حضرت کا سبق یا تقریر، حشو وزوائد اور لفظی تعقید وغیرہ سے مکمل پاک ہوتی تھی، آپ ہر بات سمجھ کر اور سلجھا کر مرتب انداز میں پیش فرماتے تھے؛ تا کہ سامعین بآسانی سمجھ سکیں۔

(۶) آپ سبق، تقریر یا مجلس میں اس قدر جامع، واضح اور مرتب وبا سلیقہ گفتگو فرماتے کہ وہ عوام وخواص سب کے لیے مفید ہوتی، اہل علم اور ذہین طلبہ کلام کے اسلوب وتعبیرات سے اپنی اپنی صلاحیت کے مطابق مختلف نکات وباریکیاں اخذ کر لیتے اور غیر اہل علم اور کمزور طلبہ اصل بات واضح طور پر سمجھ جاتے۔ آپ کی گفتگو نہ اس قدر مفصل ہوتی کہ اہل علم اور ذہین طلبہ اکتا جائیں اور نہ اتنی دقیق ومجمل یا غیر مرتب کہ عوام اور کمزور طلبہ کے سر سے گذر جائے یا انھیں سمجھنے میں پریشانی ہو۔ ایسی جامع، واضح اور مرتب وبا سلیقہ گفتگو کرنے والا احقر نے اپنی اب تک کی زندگی میں شاید کسی

اور کو نہیں دیکھا۔

(۷) جو بات آپ کو معلوم نہ ہوتی، آپ صاف فرمادیتے کہ مجھے معلوم نہیں، آپ کسی نامعلوم کے بارے میں بے بنیاد عقلی گھوڑے دوڑانے کا مزاج نہیں رکھتے تھے اور نہ اٹکل پچو سے کوئی بات ارشاد فرماتے تھے۔ یہ بڑی بات ہے۔ آج کل بہت سے اہل علم ہر مسئلے میں الٹی سیدھی رائے پیش کرنے کا مزاج رکھتے ہیں اور اسے اپنا کمال سمجھتے ہیں۔ اور اگر کوئی غلطی پر متنبہ کرتا ہے تو تاویلات باردہ یا کمزور ترین دلائل کا سہارا لے کر ضد بازی کا مظاہرہ کرتے ہیں، جو انتہائی افسوسناک امر ہے۔

ایک موقع پر حضرت والا نے ارشاد فرمایا:

''آدمی جب بھی کوئی بات کہے تو اس کے پاس اس کا پختہ ثبوت ہونا چاہیے کہ اگر کوئی ثبوت معلوم کرے تو فوراً پیش کردے اور ہمیشہ کم بولنا چاہیے، زیادہ بولنے کا مزاج اچھا نہیں''۔

ایک دوسرے موقع پر حضرت والا نے ارشاد فرمایا:

''میں کبھی کچی بات نہیں کہتا، میں ہمیشہ مضبوط و پکی بات ہی کہتا ہوں''۔

(۸) اگر کسی مسئلے میں خطا واضح ہوجاتی تو آپ حق بات قبول کرنے میں ذرا تامل نہ فرماتے اگرچہ کہنے والا شاگرد ہو یا کوئی چھوٹا شخص، احقر نے اس کا بارہا مشاہدہ کیا ہے؛ چناں چہ:

❖ دورہ حدیث شریف کے سال، ترمذی شریف کے سبق میں ایک دن آپ نے کوئی بات ارشاد فرمائی (جو اس وقت ذہن میں نہیں ہے) اور وہ احقر کے مطالعے کے خلاف تھی، احقر نے دوسرے دن، عصر بعد کی مجلس میں شیخ عبدالفتاح ابوغدہؒ کی تعلیق قواعد فی علوم الحدیث کے حوالہ سے حضرت والا کی خدمت میں اشکال پیش کیا تو حضرت والا نے حسب معمول فرمایا: ''کتاب لے کر آؤ، میں طالب علم کے حوالہ پر اعتماد نہیں کرتا''۔ دوسرے دن احقر کتاب لے کر حاضر ہوا، حضرت والا نے متعلقہ بحث ملاحظہ فرما کر ارشاد فرمایا:

''ایک اصول یاد رکھو! سبق یا تقریر میں جو بات کہی جاتی ہے، وہ حرف آخر نہیں ہوتی''۔

یعنی: حضرت والا نے شیخ عبد الفتاح ابو غدہؒ کی بات قبول فرمائی اور ایک نہایت قیمتی اصول سے احقر کو مستفیض فرمایا، جس نے راقم السطور کو اکابر کے اقوال وافعال کے سلسلے میں ایک مضبوط اور واضح رخ کی رہنمائی کی اور جس سے اب تک کی زندگی میں ناچیز نے بے پناہ فائدہ اٹھایا ہے، یعنی: کسی بھی بڑی سے بڑی شخصیت کی بات بلا تحقیق ودلیل حرف آخر نہیں سمجھنی چاہیے۔ بہت سے احباب جب ان کے سامنے کسی بڑی شخصیت کا کوئی قول یا عمل آتا ہے تو وہ شدت عقیدت ومحبت میں آنکھ بند کر کے قبول کر لیتے ہیں اور اسے حرف آخر سمجھتے ہیں اور اگر کوئی خطا پر متنبہ کرتا ہے تو صحیح بات سمجھنے کے بجائے بیجا بحث ومباحثہ کرتے ہیں، جو ہرگز مناسب نہیں؛ بلکہ جو حضرات علم وفہم کی صفت سے بہرہ ور ہوں، انھیں ہر بات دلیل وتحقیق کی روشنی ہی میں لینی چاہیے۔

❖ حضرت الاستاذ نے دورہ حدیث شریف کے سال ایک دن سبق میں فرمایا:

> ''کفارہ مجلس کی دعا (سبحان اللہ وبحمدہ الخ) تبلیغ والوں نے فضائل اعمال کی تعلیم کے ساتھ خاص کر لی ہے، جو غلط ہے؛ بلکہ وہ تو اِس کا محل ہی نہیں ہے، اس (مجلس) میں کون سا گناہ ہوتا ہے، جس کے کفارے کے لیے دعا پڑھی جاتی ہے؟''

احقر نے اسی دن یا دوسرے دن، عصر بعد کی مجلس میں حضرت والا کی خدمت میں مسند احمد اور سنن نسائی وغیرہ کی وہ روایت پیش کی، جس میں یہ صراحت تھی کہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نماز، ذکر وقراءت کی مجلس یا کسی بھی مجلس سے اٹھتے وقت یہ کلمات پڑھا کرتے تھے اور حضرت عائشہؓ کے سوال پر یہ بھی ارشاد فرمایا: اگر مجلس میں کوئی لغو بات یا کام نہ ہوا ہو تو ان کلمات سے خیر کے کاموں پر مہر لگ جاتی ہے۔ اور اگر کوئی لغو بات یا کام ہوا ہو تو یہ اس کے لیے کفارہ ہوتے ہیں۔

(حصن المسلم:۷۰، إتحاف المسلم بشرح حصن المسلم:۴-۱۳۰-۱۳۰۶)

حضرت اقدس نے وہ روایت بہ غور ملاحظہ فرمائی اور سابقہ قول سے رجوع فرمالیا اور احقر نے اپنی ڈائری میں نوٹ کیا ہوا ہے کہ حضرت والا نے سنہ: ۱۴۲۷ھ میں ترمذی شریف کے سبق میں

فرمایا، جس میں احقر بھی حاضر تھا:

''یہ دعا صرف فضائل اعمال کی تعلیم کی مجلس سے اٹھتے وقت پڑھنا اور ان مجالس سے اٹھتے وقت نہ پڑھنا، جن میں لغو باتیں بھی ہوئی ہوں، صحیح نہیں؛ بلکہ ہر مجلس سے اٹھتے وقت پڑھنی چاہیے، کسی مجلس کے ساتھ خاص کرنا غلط ہے''۔

اور حضرت اقدس نے (سنہ: ۱۴۳۰ھ میں) تحفۃ الالمعی میں ارقام فرمایا:

''لوگ فضائل کی تعلیم کے بعد تو اس دعا کا اہتمام کرتے ہیں؛ جب کہ اس مجلس میں کوئی لغو بات نہیں ہوتی؛ مگر وہ حضرات بھی اپنی دیگر مجالس میں اس ذکر کا اہتمام نہیں کرتے، یہ بات ٹھیک نہیں، اور عام مسلمان تو گویا کفارۃ المجلس جانتے ہی نہیں۔ فیا للأسف!'' (تحفۃ الالمعی: ۱۰۲/۸)

❖ تدریب افتا کے سال احقر نے ایک مرتبہ عرض کیا: دور حاضر میں جدید مسائل پر فلاں، فلاں اہل علم، کثرت سے لکھتے ہیں، آپ کی رائے میں احقر کے لیے ان میں سے کس کی کتابیں یا تحریریں پڑھنا مناسب ہے؟ مشورہ عنایت فرمائیں!

حضرت والا نے فرمایا:

''سب کو پڑھو؛ لیکن کسی کی بات اندھے، بہرے بن کر مت لو''۔

یہ حضرت والا نے عباد الرحمٰن کی صفات میں سے اس صفت کی طرف اشارہ فرمایا ہے، جس کا تذکرہ سورہ شعراء، آیت: ۷۳ میں آیا ہے، یعنی: **والذین إذا ذکروا بآیت ربهم لم یخروا علیها صما وعمیانا**۔

❖ اسی طرح ایک موقع پر ایک مسئلہ کے تعلق سے فتاوی رحیمیہ وغیرہ کا حوالہ دیا گیا اور فتاوی رحیمیہ کا وہ مسئلہ، حضرت والا کی رائے میں بجا طور پر قابل اشکال تھا، احقر نے بھی حضرت والا کی تائید میں چند فقہی مؤیدات ذکر کیں، حضرت والا نے ان کی تصدیق فرمائی، پھر عرض کیا گیا کہ ہم اصاغر کے لیے اکابر کی تصریحات سے ہٹنا مشکل ہوتا ہے، یہ سن کر حضرت والا نے ارشاد فرمایا:

''کسی کی بات اندھے بن کر نہیں لینی چاہیے''۔

حضرت والا کی اس بیش بہا وقیمتی نصیحت سے راقم الحروف کا مزاج یہ بنا کہ احقر، خود حضرت والا کی بھی کوئی بات، بلا سوچے، سمجھے نہیں لیتا تھا۔ اگر حضرت والا کی کسی بات پر اشکال ہوتا تو مطالعے اور غور و فکر کے بعد حضرت والا کی خدمت میں ادب و احترام کے ساتھ اشکال پیش کرتا تھا۔

❖ جب حضرت والا نے تفسیر ہدایت القرآن جلد دوم کا آغاز فرمایا تو ایک دن احقر کو بلا کر فرمایا: ''سورہ نساء میں احکام کی آیات بہ کثرت ہیں، تفسیر کے دوران احکام بھی لکھنے ہوتے ہیں؛ لہٰذا میں جو حصہ لکھتا جاؤں، وہ تم دیکھ لیا کرو''۔ احقر نے سعادت سمجھ کر حضرت والا کے حکم کی تعمیل کی اور ہفتہ، دس دن میں جب ۶۰، ۷۰ / صفحے ہو جاتے تو حضرت والا، احقر کو بلا کر مسودہ مرحمت فرماتے یا کسی کے ذریعے احقر کے گھر بھیجواتے، پھر احقر ایک، ایک لفظ نہایت غور و فکر سے دیکھتا اور ضرورت پر تفسیر کی عربی اور اردو کتابوں کی مراجعت کرتا، پھر دوسرے دن بعد عشا حضرت والا کی خدمت میں حاضر ہو کر مذاکرہ کرتا، حضرت والا ہر قابل قبول بات خندہ پیشانی سے قبول فرماتے اور خوب دعائیں دیتے۔

❖ تحفۃ القاری میں ایک جگہ حضرت والا نے ارقام فرمایا:

''جہاں شبہ ہو، تحقیق کریں اور حق کی پیروی کریں، میرے لکھے پر بھروسہ نہ کریں''۔

(تحفۃ القاری: ۱۲/ ۳۸۱)

اس کے برخلاف حضرت والا جس بات کو صحیح دلائل کی روشنی میں حق سمجھتے تو ''سارا جہاں خلاف ہو، پروانہ چاہیے'' پر عمل پیرا ہوتے، حضرت والا کی زندگی میں اس کے بے شمار واقعات پیش آئے۔ حضرت والا، کسی بڑی سے بڑی شخصیت یا جماعت یا جم غفیر سے مرعوب ہونے کا مزاج نہیں رکھتے تھے؛ بلکہ بہر صورت حق کی اتباع فرماتے اور اس کے لیے ہر قسم کی قربانی کے لیے تیار رہتے، اس میں نہ لوگوں کی مخالفت کی پرواہ فرماتے اور نہ کسی عہدہ یا ملازمت کے چلے جانے کا خیال فرماتے۔ اور آپ اس طرح کے بلند ہمت احباب واصحاب سے بھی محبت فرماتے، ان کی قدر فرماتے اور ان کی حوصلہ افزائی بھی فرماتے؛ کیوں کہ حفاظت دین کے لیے حق کے سلسلے میں اس درجہ کا تصلب ناگزیر

ہے اور سنت اللہ یہ ہے کہ اللہ تعالی ہر دور میں اس طرح کے بندے پیدا فرماتے رہتے ہیں، جو ذاتی و دنیوی اغراض سے اوپر اٹھ کر محض حفاظت دین اور احقاق حق و ابطال باطل کے لیے ہر جتن اور قربانی کے لیے تیار رہتے ہیں اور اللہ تعالی ایسے بندوں کی حفاظت بھی فرماتے ہیں۔ اور حق، حق ہے خواہ وہ عقیدے سے متعلق ہو یا اعمال سے، نیز کوئی اصل ہو یا جزئی اور شریعت میں اس کا درجہ فرض یا واجب کا ہو یا صرف سنت یا مستحب کا، ہر حق شریعت میں درجہ بہ درجہ اپنی اہمیت رکھتا ہے؛ کیوں کہ حق کی نسبت، اللہ تعالی کی طرف ہوتی ہے۔

(۹) حضرت والا کی خدمت میں جب کوئی کتاب، تصدیق یا تقریظ کے لیے آتی تو آپ پوری کتاب بہ نظر غائر ملاحظہ فرماتے، پھر جو رائے قائم ہوتی، وہ تحریر فرماتے۔ اور اگر کوئی قابل اصلاح بات ہوتی تو اس کی نشان دہی فرماتے۔ اور اگر کوئی مصنف یا مؤلف اصلاح کے لیے تیار نہ ہوتا تو آپ اس کی کتاب واپس فرمادیتے۔ اور آپ فرمایا کرتے: ''تصدیق یا تقریظ کی حیثیت، شہادت کی ہوتی ہے؛ لہٰذا کتاب پڑھے بغیر شہادت کا کیا مطلب؟'' اور اگر کوئی کہتا کہ صرف دعائیہ کلمات لکھ دیں تو فرماتے: ''اگر صرف دعا مقصود ہے تو لکھوانے کی کیا ضرورت؟ وہ تو میں ابھی زبانی کرسکتا ہوں''۔ اور اگر کسی محقق و متبحر عالم کی کتاب ہوتی اور آپ اسے مکمل ملاحظہ نہ فرماتے تو تقریظ میں اس کا تذکرہ ضرور فرماتے۔

راقم الحروف کے ذہن میں اس سلسلے کے مختلف واقعات ہیں، جنھیں پیش کرنے کی ضرورت نہیں؛ البتہ بہ طور مثال صرف ایک واقعہ ذکر کرتا ہوں:

احقر جب افتا کا طالب علم تھا تو ایک دن عصر بعد کی مجلس میں ایک نوجوان فاضل، اپنی تصنیف کردہ کتاب کے ساتھ حضرت والا کی خدمت میں تقریظ کے لیے حاضر ہوئے اور پہلے صفحہ پر موصوف کے نام کے ساتھ ''حضرت مولانا'' لکھا ہوا تھا۔ حضرت نے فرمایا: ''یہ کون حضرت ہیں؟''، موصوف نے عرض کیا: یہ میرا نام ہے۔ حضرت نے فرمایا: ''ابھی سے اتنے بڑے مولانا بن گئے؟ حضرت مولانا...... اور ابھی داڑھی کا ایک بال بھی سفید نہیں ہوا!'' پھر حضرت والا نے ان کی کتاب

مختلف مقامات سے دیکھی، ایک جگہ انہوں نے داعی کی تعریف کرتے ہوئے لکھا تھا: گھر بار چھوڑ کر، بوریہ، بستر کاندھے پر لاد کر قریہ، قریہ، بستی بستی گھومنے اور ایسا ایسا کرنے والے کو داعی کہتے ہیں۔ حضرت نے فرمایا: ''یہ تعریف کہاں سے لی؟ اور کیا دوسرے لوگ داعی نہیں؟'' موصوف نے عرض کیا: اس میں حصر نہیں ہے۔ حضرت نے فرمایا: ''تعریف میں حصر، غیر حصر کی بات نہیں ہوتی''۔ پھر فرمایا: ''کتاب میں معلوم نہیں کہ اس طرح کی کتنی باتیں ہوں گی اور کہاں کہاں تم نے اوندھا مارا ہوگا؟'' اور فرمایا: ''جاؤ، دارالعلوم کے کسی استاذ کو پوری کتاب دکھاؤ اور ان سے کہہ دو کہ قلم لے کر بیٹھو کہ جس بات پر آپ کو اشکال ہو، اُسے کاٹ دو، انھیں اس اختیار کے ساتھ کتاب دو''۔ وہ کہنے لگے: آپ ہی دیکھ لیجیے، حضرت نے فرمایا: ''میرے پاس وقت نہیں''۔ پھر جب موصوف نے زیادہ اصرار کیا تو آپ نے ناراضگی کے ساتھ فرمایا: ''جاؤ، اپنی ذمہ داری پر کتاب چھاپو، میرے کاندھے پر رکھ کر بندوق مت چلاؤ''۔ پھر فرمایا: ''کل (پنجشنبہ) ایک بڑا مولوی آرہا ہے، شیخ الحدیث بھی ہے اور مفتی بھی اور ۲۰ر کتابوں کا مصنف بھی، اس کی کتاب دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ اس کی کتاب پر تو پڑھے بغیر لکھ سکتا ہوں؛ لیکن تم جیسوں کی تو پوری کتاب دیکھنا ضروری ہے''۔

پھر جب دوسرے دن حضرت مفتی شبیر احمد صاحب مدظلہ العالی (مدرسہ شاہی مرادآباد) اپنی نئی تصنیف: انوار مناسک کے ساتھ حاضر خدمت ہوئے تو آپ نے فرمایا: ''کتاب چھوڑ جاؤ، میں پوری کتاب دیکھوں گا، پھر لکھوں گا''۔ پھر آپ نے روزانہ بعد عصر انوار مناسک دیکھنی شروع کی اور جگہ، جگہ اصلاحات فرمائیں اور تقریباً ایک، ڈیڑھ ہفتہ میں نظر ثانی کا کام مکمل ہوا۔ اسی دوران ایک دن احقر نے عرض کیا کہ آپ نے تو ارشاد فرمایا تھا: ''مفتی صاحب کی کتاب پر میں پڑھے بغیر لکھ سکتا ہوں''، پھر آپ اپنا اصل کام (تصنیف وتالیف) چھوڑ کر یہ زحمت کیوں فرمارہے ہیں؟ حضرت والا مسکراہٹ کے ساتھ خاموش رہے، یعنی: حضرت الاستاذ کو مفتی صاحب کی انوار مناسک پر بھی پڑھے بغیر، تقریظ لکھنے پر شرح صدر نہیں ہوا۔ اور آپ نے انوار مناسک کی تقریظ میں بعض جدید مسائل میں اپنا اختلاف واضح کرتے ہوئے بہ طور خاص یہ تحریر فرمایا: ''نئے مسائل میں اختلاف

رائے ممکن ہے؛ چناں چہ ان کی نشان دہی کردی گئی ہے''۔

(۱۰) حضرت والا، کسی مدرسہ کے لیے تصدیق یا معائنہ اُسی وقت تحریر فرماتے؛ جب آپ کو مدرسہ اور امور مدرسہ سے متعلق، مکمل اطمینان ہوجاتا اور اگر کسی مدرسہ کی سرپرستی قبول فرماتے تو مکمل ذمہ داری نباہتے، صرف نام کے لیے سرپرستی آپ ہرگز پسند نہ فرماتے تھے۔ اور جو حضرات بلا تحقیق مدارس کے لیے معائنہ یا تصدیق لکھ دیتے ہیں، حضرت والا کی نظر میں اُن کی دریا دلی صحیح نہیں تھی۔ ایک مرتبہ حضرت والا نے عصر بعد کی مجلس میں ارشاد فرمایا:

> ''میں دوران سفر راستہ میں کسی مدرسے میں نہیں جاتا ہوں، جس مدرسہ میں جاؤ، رجسٹر لے کر آجائیں گے کہ اپیل لکھ دو، معاینہ لکھ دو۔ میں بھاگل پور جارہا تھا، راستہ میں استنجا کا تقاضہ ہوا، ایک مدرسہ کے قریب گاڑی روکی گئی اور جب میں استنجا سے فارغ ہوا تو مدرسہ کے مہتمم صاحب رجسٹر لے کر آگئے کہ معائنہ لکھ دو، میں نے ان کو ڈانٹا اور یہ کہا: کیا یہی لکھ دوں کہ میں نے یہاں استنجا کیا ہے؟ مہتمم نے کہا کہ بیٹھیے! چائے پلاتا ہوں۔ میں نے کہا: میں تیری چائے نہیں پیتا اور ساتھیوں سے کہا: چلو''۔

(۱۱): آپ نے افتا کے سال ''شرح عقود رسم المفتی''، حضرت مولانا مفتی سید مہدی حسن صاحب شاہ جہاں پوریؒ (سابق صدر مفتی دار العلوم دیوبند) سے پڑھی تھی اور وہ بھی صرف سات دن میں۔ اُس وقت یہی ایک کتاب افتا میں داخل نصاب تھی اور آپ نے فتاوی کی مشق وتمرین بھی حضرت مفتی صاحبؒ سے کی تھی اور آپ اپنے استاذ سے بے انتہا متأثر تھے؛ اس لیے فقہ وفتاوی کے سلسلے میں آپ پر حضرت مفتی صاحب کی خاص چھاپ تھی، جس کی وجہ سے آپ فقہ وفتاوی کے باب میں بھی خاص ذوق رکھتے تھے اور اس سلسلہ میں آپ طالبین کی رہنمائی بھی فرمایا کرتے تھے۔ اللہ تعالی نے ناچیز کو فقہ وفتاوی کے باب میں بھی حضرت والا سے استفادے کا موقع عطا فرمایا ہے، اگر اللہ تعالی نے توفیق عطا فرمائی تو فقہ وفتاوی کے سلسلے میں ناچیز، حضرت والا کے قیمتی افادات پیش کرنے کی کوشش کرے گا۔

(۱۲) مسلک اکابر علمائے دیوبند، یعنی: مسلک اہل السنۃ والجماعۃ کی تبیین وتشریح، حضرت والا کا خاص موضوع تھا، آپ گاہے گاہے اسباق، تقاریر اور مجالس میں اس موضوع پر کلام فرماتے رہتے تھے اور قدیم بدعات وخرافات کے علاوہ نئی پیدا ہونے والی یا رواج پانے والی بدعات ورسومات پر بھی آپ، بلا خوف وخطر، کھل کر نکیر فرماتے تھے۔

ایک مرتبہ آپ نے دیوبندیت سے متعلق درج ذیل اہم بات ارشاد فرمائی:

''دیوبندیت، اکابر علمائے دیوبند کے افعال واحوال کا نام نہیں ہے؛ بلکہ انہوں نے قرآن وسنت اور فقہ کی روشنی میں جو اصول وضوابط منقح فرمائے ہیں اور جن کے ذریعے انہوں نے اپنے دور میں رائج بدعات وخرافات کی تردید فرمائی ہے، دیوبندیت اُن اصول وضوابط کا نام ہے؛ لہٰذا کسی بھی چیز کو مسلک کا جز وقرار دینے کے لیے اکابر کے منقح کردہ اصول وضوابط کا اتباع ضروری ہے، نہ کہ اکابرین میں سے کسی کے افعال واحوال کا؛ بلکہ (بلا کسی استثنا) ہر شخص کا قول وفعل ان اصول پر پیش کرنا ضروری ہے؛ ورنہ ہم میں اور رضا خانیوں میں کیا فرق رہ جائے گا؟ وہ بھی مستحسنات مشائخ کو جائز قرار دیتے ہیں اگر چہ قرآن وسنت اور فقہ سے ان کی تائید نہ ہوتی ہو اور ہم بھی اپنے اکابر کے اقوال وافعال آنکھ بند کر کے لے رہے ہیں۔ اور یہ اصول وضوابط حضرت گنگوہیؒ کے فتاوی اور براہین قاطعہ وغیرہ کے سیکڑوں صفحات میں پھیلے ہوئے ہیں۔ آج ہمارے فضلا کو دیوبندیت کا پتہ نہیں، انھیں دیوبندیت سمجھنے کے لیے اکابر کی ان کتابوں کا مطالعہ کرنا چاہیے''۔

(۱۳) معدودے چند مسائل، جن میں حضرت والا کا دار الافتا سے اختلاف ہوتا یا کسی نئے مسئلے میں آپ کی الگ رائے ہوتی، آپ لوگوں کو اس پر عمل سے منع فرماتے اور یہ فرماتے: ''یہ میری رائے ہے؛ لیکن عمل دار الافتا کے فتوے پر ہوگا'' یا آپ فرماتے: ''مفتیان کرام کو اس پر غور کرنا چاہیے، جب وہ قبول کرلیں تو اس پر عمل کیا جا سکتا ہے''۔

اور مسائل بتانے میں آپ بہت احتیاط فرماتے اور اگر مجلس میں کوئی طالب علم مسئلہ معلوم کرتا تو فرماتے: ''مسئلے مسائل کے لیے دارالافتا جاؤ''، یا اگر احقر مجلس میں حاضر ہوتا تو فرماتے: ''یہ دارالافتا کے مفتی صاحب ہیں، ان سے معلوم کرو''۔ اور اگر احقر کی موجودگی میں مسئلے کا کوئی فون آتا تو فرماتے: ''میرے پاس دارالافتا کے ایک مفتی صاحب تشریف فرما ہیں، ان سے معلوم کرو''، پھر مجھے فون دیدیتے۔

اور جب احقر دارالافتا کا طالب علم تھا تو ایک دن فرمایا: ''دارالافتا کے ایک، دو مفتیان کرام کے موبائل نمبر لے آؤ، لوگ مجھ سے مسئلہ معلوم کرتے ہیں، میں انھیں مفتی صاحب کا نمبر دیدیا کروں''، تو میں نے دو مفتیان کرام کے نمبر ایک پرچی میں لکھ حضرت والا کو پیش کیے، حضرت والا نے وہ نمبرات اپنی نشست گاہ کے پاس چپکا لیے اور جب کبھی مسئلے کے بارے میں فون آتا تو آپ سائل کو ان میں سے کسی مفتی کا نمبر بتا کر مفتی صاحب سے رابطہ کے لیے فرماتے اور از خود کوئی مسئلہ بتانے سے گریز فرماتے۔

(۱۴)　حضرت والا، کھانے، پینے، پہننے، اوڑھنے وغیرہ ہر چیز میں سادگی پسند فرماتے، حضرت کا لباس بہت اعلی یا بہت مہنگا نہیں ہوتا؛ بلکہ درمیانی درجہ کا لباس زیب تن فرماتے اور ہفتہ میں صرف دو دن (جمعہ اور منگل کو) لباس تبدیل فرماتے، ہر دوسرے یا تیسرے دن لباس تبدیل فرمانے کا معمول نہیں تھا۔ اور اگر کبھی پان کا دھبہ لگ جاتا تو صرف اس حصہ کو خود دھو لیتے یا کسی سے دھلوا لیتے۔ اور سردیوں میں آپ کے پاس ایک رنگین ہلکا گرم کرتا تھا، آپ اکثر اسی کو استعمال فرماتے اور اس کے ساتھ ایک گرم صدری۔ اور اگر کبھی زیادہ سردی ہوتی تو ایک چھوٹی ہلکی گرم چادر استعمال فرماتے، وہ چادر میں نے حضرت کے پاس ایک لمبے زمانہ سے دیکھی تھی، آپ کی چپل یا جوتا بھی سادہ ہوا کرتا تھا۔

حضرت والا کا دسترخوان بھی سادہ تھا، احقر نے حضرت والا کے ساتھ آپ کے دسترخوان پر دسیوں مرتبہ کھانا کھایا ہے اور احقر نے آپ کے دسترخوان پر شاید باید دو سے زائد سالن دیکھے ہیں اور

آپ اکثر صرف روٹی تناول فرماتے، کبھی کبھار چاول بھی، روزانہ چاول کا معمول نہیں تھا۔ اسی طرح زندگی کے دیگر شعبوں میں بھی احقر نے سادگی ہی دیکھی ہے۔

(۱۵) حضرت والا، ضرورت سے زیادہ مال جمع کرنے یا محض عیش و آرام کے لیے اپنے اوپر خرچ کرنے کو پسند نہیں فرماتے تھے، حضرت والا پر جب وسعت کا دور آیا تو آپ اپنے پاس صرف بہ قدر ضرورت پیسہ رکھتے، باقی دوسروں پر صرف فرما دیا کرتے۔ اور آپ کے پاس جو ہدایا و تحائف آتے، آپ وہ اکثر اپنے بچوں میں یا احباب و متعلقین میں تقسیم فرما دیتے، آپ کا مزاج جمع کرنے کا نہیں تھا۔ ایک مرتبہ حضرت والا کے پاس صرف احقر حاضر تھا، کسی بڑے عالم کا تذکرہ آیا تو حضرت والا نے ارشاد فرمایا:

''اگر اللہ تعالیٰ کسی کو دولت سے نوازیں تو یہ کیا ضروری ہے کہ ساری دولت اپنے اوپر خرچ ہو؟ جو ضرورت سے زائد ہو، وہ آدمی دوسروں پر خرچ کردے''۔

نیز حضرت والا سے بارہا سنا گیا:

''اگر ایک طرف سے مال آتا ہے تو دوسری طرف بڑھانا بھی چاہیے۔ اور جب آگے نہیں بڑھایا جائے گا تو پائپ بھر جائے گا اور پھر مزید کیسے آئے گا؟''

(۱۶) حضرت والا نے مختلف خصوصی مجالس میں متعدد بار ارشاد فرمایا:

''میں نے کبھی کسی بڑی کتاب کے لیے یا کسی عہدہ کے لیے کوئی درخواست نہیں دی اور نہ کوئی کوشش کی، پھر بھی اللہ تعالیٰ نے سب کچھ عطا فرمایا۔''

اور آپ اپنے خاص متعلقین اور قریبی شاگردوں سے بھی یہی چاہتے تھے اگرچہ اُن سے صاف صاف نہیں فرماتے تھے۔

(۱۷) حضرت والا سے بارہا سنا گیا کہ میں نے سب معاملات صاف کرلیے ہیں اور بچوں میں سب چیزیں تقسیم کردی ہیں، اب میرے پاس صرف ہدایت القرآن اور چند چیزیں رہ گئی ہیں، اگر میرا ابھی انتقال ہوگیا تو بچوں کو میرے بعد تقسیم میں کوئی پریشانی نہیں ہوگی اور کبھی ارشاد فرماتے:

''میں نے موت کے لیے بوریہ بستر باندھ رکھا ہے، جب بلاوا آ جائے، تیار بیٹھا ہوں۔''

اللہ تعالی مجھ ناچیز کو بھی موت کے لیے ہر وقت تیار رہنے کی توفیق عطا فرمائیں۔

۲۵/رمضان (سنہ:۱۴۴۱ھ، مطابق:۱۹/مئی، سنہ:۲۰۲۰ء، سہ شنبہ) کو صبح ساڑھے چھ اور پونے سات بجے کے درمیان، حضرت الاستاذ حضرت اقدس مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری (سابق شیخ الحدیث وصدر المدرسین دارالعلوم دیوبند) کی وفات کا جو واقعہ پیش آیا، حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک بہت بڑا سانحہ ہے، جس سے حضرت کی اولاد، اعزہ واقارب، تلامذہ، متوسلین، مستفیدین اور محبین سبھی کو درجہ بہ درجہ سخت صدمہ ہوا ہے اور اہل علم بالخصوص علمائے دیوبند میں ایسا خلا ہوا ہے، جو بہ ظاہر عرصہ دراز تک محسوس کیا جائے گا اور حضرت کے محبین اور قدر دانوں کو حضرت کی خصوصیات وکمال رہ رہ کر یاد آئیں گی۔

حضرت کی وفات پر بعض اہل علم کا تأثر یہ ہے کہ ان کی اب تک کی زندگی میں کسی کی وفات پر پیش آنے والا یہ سب سے بڑا صدمہ تھا، انھیں ایسا صدمہ خود ان کے والد ماجد کی وفات پر بھی نہیں ہوا اور وفات کی خبر سن کر وہ کئی دن تک کوشش کے باوجود گریہ روکنے پر قادر نہیں ہو سکے اور اب بھی جب انھیں حضرت والا کی یاد آتی ہے تو سابقہ کیفیت واپس آیا چاہتی ہے۔

اللہ تعالی حضرت اقدس مفتی صاحب نور اللہ مرقدہ کی ہر طرح کی دینی وعلمی خدمات قبول فرمائیں، آپ کی بال بال مغفرت فرمائیں، کروٹ کروٹ سکون وراحت اور عافیت تامہ عطا فرمائیں اور جنت الفردوس میں اعلی مقام عطا فرمائیں اور امت مسلمہ کی فتنوں سے حفاظت فرمائیں۔ **آمین یا رب العالمین!**

اس وقت راقم الحروف کے سامنے جناب مولانا مفتی **محمد مرشد** صاحب قاسمی (استاذ جامعہ

اسلامیہ مسیح العلوم بنگلور) کی ''میرے محسن، میرے مرشد'' نامی کتاب ہے، احقر نے موصوف کی پوری کتاب از اول تا آخر پڑھی ہے، موصوف نے بھی حضرت اقدس مفتی صاحب نور اللہ مرقدہ کی خدمت میں رہ کر خوب استفادہ کیا ہے اور موصوف کا حضرت والا سے مسترشدانہ تعلق بھی تھا، موصوف نے اس کتاب میں حضرت اقدس مفتی صاحب کی تربیت، شفقت ومحبت اور سرپرستی کے واقعات جمع فرمائے ہیں، جن میں موصوف نے حضرت والا کے تعلق سے اپنے قلبی احساسات اور جذبات کی بھی ترجمانی کی ہے اور ان واقعات کے ضمن میں موصوف نے ایک بہترین وکام یاب شاگرد کی عملی تصویر پیش کی ہے، جس کی مثال آج کل خال خال ہی ملتی ہے۔

اگر طلبہ عزیز، جناب مفتی مرشد صاحب کو نمونہ بناتے ہوئے اپنے باصلاحیت ومحنتی اساتذہ کرام کو سمجھیں اور ان سے صرف درسگاہوں تک تعلق نہ رکھ کر خارجی تعلق بھی رکھیں؛ بلکہ جس استاذ کی علمی صلاحیت وقابلیت، فہم وفراست اور تقوی وطہارت سے طبیعت مطمئن ہو، اُن سے قریب ہوکر بھرپور استفادہ کریں اور ان کے سامنے اپنے آپ کو مٹادیں اور کوئی بھی کام، اُن کے مشورے کے بغیر نہ کریں اور یہ تعلق کسی دنیوی غرض پر مبنی نہ ہو، صرف علمی وتربیتی استفادے اور خدمت کا تعلق ہو تو آج بھی بہترین رجال کار تیار ہوسکتے ہیں۔ آج کل مدارس میں بالخصوص بڑے مدارس میں عام طور پر طلبہ کا اساتذہ سے جو صرف درسگاہ کی حد تک تعلق ہوتا ہے اور وہ بھی محض رسمی، یہ طلبہ ٔمدارس کے حق میں کچھ اچھا نہیں ہے، ایک موقعہ پر حضرت الاستاذ نور اللہ مرقدہ نے ارشاد فرمایا تھا:

> ''آج کل مدارس اسلامیہ میں اساتذہ وطلبہ کے درمیان جو دوری پائی جاتی ہے، یہ انتہائی نقصان دہ ہے، طالب علم دورہ حدیث شریف تک ۳۰ سے زائد اساتذہ سے مختلف علوم وفنون پڑھتا ہے اور اس پر کسی ایک استاذ کا ایک فیصد بھی رنگ نہیں چڑھتا۔ اب ان حالات میں اگر کوئی گمراہ جماعت انھیں اچک لے تو کیا شکوہ؟''

آج کل، طلبہ اور اساتذہ کا تعلق صرف درسگاہوں کی حد تک محدود ہوگیا ہے اور جو طلبہ اساتذہ سے تعلق رکھتے ہیں، وہ عام طور پر محض خادمانہ تعلق رکھتے ہیں، مستفیدانہ تعلق کم رکھتے ہیں یا

مستفیدانہ تعلق ضمناً ہوتا ہے۔حضرت اقدس مفتی صاحب نور اللہ مرقدہ کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ طلبہ سے صرف علمی تعلق رکھتے تھے، خادمانہ تعلق بہت کم یا برائے نام، وہ بھی زندگی کے آخری چند سالوں میں ہوا جب آپ کو رات میں نیند نہیں آتی تھی اور پیروں میں شدید درد رہتا تھا؛ اس لیے حضرت والا سے جو بھی مربوط ہوا، وہ علم کے راستہ سے مربوط ہوا اور حضرت کی درایت وفہم سے ایسا مستفید ہوا کہ وہ پوری زندگی حضرت کے احسان سے سبک دوش نہیں ہوسکتا اور حضرت کے خاص شاگردوں کا عمومی حال یہ تھا کہ وہ حضرت کے ایک حکم واشارے پر ہر جتن وقربانی کے لیے تیار رہتے تھے۔اگر مدارس دینیہ کے باصلاحیت وباکمال اساتذہ کرام حضرت والا کی یہ خصوصیت اختیار فرمائیں اور طلبہ کرام بھی اپنے (استغنائی وبے نیازی والے) عمومی رویے ومزاج پر نظر ثانی کریں تو ہر سال مدارس میں مؤلف کتاب جیسے شاگردوں کی ایک بڑی تعداد تیار ہوسکتی ہے۔

اور آج کل جو طلبہ، اساتذہ سے ویسی محبت اور ان کی ویسی قدر نہیں کرتے ،جیسی کرنی چاہیے، اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ طلبہ اسباق میں بلا مطالعہ وتیاری پہنچتے ہیں، انھیں باصلاحیت اساتذہ کی قیمتی باتوں کی اہمیت کا اندازہ ہی نہیں ہوتا۔اور اردو شروحات اور نوٹس نے مزید کمال یہ کیا کہ عام طلبہ کے دلوں میں اساتذہ کے اسباق ہی کی اہمیت نہیں رہ گئی، وہ اسباق میں اساتذہ کی اہم باتیں لکھ کر محفوظ کرنے کی کوشش ہی نہیں کرتے اور کانوں کے راستہ ذہن میں جو کچھ پہنچتا ہے، اسے تکرار کے ذریعے محفوظ وباقی رکھنے کی فکر نہیں کرتے، بس جب امتحان آتا ہے تو اردو شروحات اور نوٹس کے ذریعے صرف امتحانی پرچے حل کرلیے جاتے ہیں؛ تاکہ امتحان میں پاس ہوجائیں اور اگلی جماعت میں ترقی مل جائے اور امداد جاری رہے، اس سے آگے ان کا کوئی مقصد نہیں ہوتا۔اور جو طلبہ کچھ محنت کا ذوق رکھتے ہیں، وہ بھی عام طور پر اردو یا عربی شروحات سے کتابیں حل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں، باصلاحیت اساتذہ کی درسی باتیں وہ بھی محفوظ نہیں کرتے۔اب ظاہر ہے کہ جب انھیں اپنے باصلاحیت وباکمال اساتذہ کی قیمتی باتوں کی اہمیت کا اندازہ ہی نہیں ہوتا تو وہ کیا اساتذہ سے محبت کریں گے اور کیا ان کی قدر کریں گے؟

اگر طلبہ عزیز درج ذیل تین کاموں کا اہتمام کریں تو **إن شاء اللہ** انھیں باصلاحیت اساتذہ سے محبت بھی ہوگی اور وہ اُن کی قدر بھی کریں گے:

(۱) ہر سبق سے پہلے اس کا مطالعہ۔ اور مطالعہ میں تین چیزیں داخل ہیں: تصحیح عبارت، ترجمہ اور اپنی بساط بھر حل عبارت کی کوشش۔ اور حل عبارت میں معلوم و مجہول میں امتیاز کی کوشش ضرور کی جائے، یعنی: جو چیز سمجھ میں آئی، وہ بھی ذہن میں محفوظ رکھی جائے اور جو سمجھ میں نہیں آئی، وہ بھی۔

(۲) استاذ کا سبق ہمہ تن گوش ہوکر سننا کہ استاذ کی کوئی بات سننے سے رہ نہ جائے اور اس پر دھیان دینا کہ مطالعہ میں سمجھی ہوئی چیز کہاں تک صحیح تھی اور نا سمجھی ہوئی کا کیا مطلب ہے؟

(۳) سبق کے بعد اس کا اعادہ، از خود دہرا کر یا تکرار کر کے، تکرار اعلی درجہ ہے، اس سے تدریسی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ اور جو بات سمجھ میں نہ آئے یا اس پر اشکال ہو تو استاذ کی خدمت میں حاضر ہو کر (ظاہری و باطنی) ادب واحترام کے ساتھ استاذ سے نا سمجھی ہوئی بات سمجھنا اور اشکال پیش کر کے اس کا حل دریافت کرنا۔ حضرت اقدس مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوریؒ عام طور پر فرمایا کرتے: "جو بات سمجھ میں نہ آئے، استاذ کے پیچھے لگو اور جب تک سمجھ میں نہ آئے، سکون سے مت بیٹھو"۔

اب جب طالب علم سبق میں تیاری کے ساتھ آئے گا تو جو باتیں اُسے مطالعے میں سمجھ میں آگئی تھیں، اگر استاذ سے اُن کی تصدیق ہوتی ہے تو طالب علم کو بے انتہا مسرت وخوشی ہوگی اور اس میں خوداعتمادی آئے گی۔ اور جو باتیں وہ کوشش کے باوجود نہیں سمجھ سکا تھا یا ان کا غلط مطلب سمجھا تھا، اب جب استاذ ایک، دو جملے میں انھیں حل کر دے گا تو اُسے احساس ہوگا کہ استاذ سے کیا ملا؟ اور جب وہ روزانہ اس طرح کی چیزوں کا تجربہ کرے گا تو خواہی نہ خواہی ضرور اس کے دل میں استاذ کی عظمت ومحبت اور قدر پیدا ہوگی اور یہ چیز اس کی علمی ترقی میں ممد ومعاون ہوگی۔ اور جب طالب علم استاذ کی خدمت میں ادب واحترام کے ساتھ اپنا اشکال پیش کرے گا، تو استاذ بھی سبق کی تیاری میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھے گا اور یہ چیز طلبہ اور اساتذہ دونوں کے لیے مشترکہ طور پر علمی ترقی کا ذریعہ ہوگی، **واللہ**

ولي التوفيق، وما ذلک علی الله بعزيز!

اخیر میں دعا ہے کہ اللہ تعالی جناب مولانا مفتی محمد مرشد صاحب کی اس مبارک کاوش کو اپنی بارگاہ اقدس میں شرف قبول عطا فرمائیں اور ہم سب کو اکابر اساتذہ کرام بالخصوص مفسر قرآن، محدث کبیر، ترجمان مسلک اکابر علمائے دیوبند، حضرت اقدس مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری نور اللہ مرقدہ کی ذات گرامی سے جو کچھ حاصل ہوا ہے، اس میں بقاو تحفظ اور ترقی عطا فرمائیں اور ان کے نقش قدم پر چل کر دین و شریعت کی مخلصانہ، بے لوث اور قابل قبول خدمت اور دیگر اعمال صالحہ کی توفیق ارزانی فرمائیں۔ آمین یا رب العالمین، **وصلی الله تعالی علی خير خلقه محمد وآله وأصحابه أجمعين، والحمد لله رب العالمين۔**

وکتبہ

محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ

خادم افتا، دارالعلوم دیوبند

۹/ذی الحجہ، سنہ:۱۴۴۱ھ=۳۱/جولائی، سنہ:۲۰۲۰ء، بہ روز جمعہ
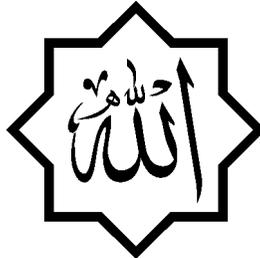
بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تاثرات

شارحِ سراجی، صاحبِ قلم حضرت اقدس

مولانا مفتی وڈاکٹر **اشتیاق احمد** صاحب زیدت معالیہ

(استاذ دارالعلوم دیوبند)

نحمده و نصلي على رسوله الكريم ، أما بعد !

میرے محسن ومربی حضرت استاذِ محترم مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری رحمۃ اللہ علیہ (سابق شیخ الحدیث وصدر المدرسین دارالعلوم دیوبند)، عالمِ اسلام میں ممتاز ترین شخصیت کے حامل تھے، جنھوں نے اپنے کو علم ودین کے لیے خاص وخالص کررکھا تھا، یہی اُن کا اوڑھنا بچھونا تھا، حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ کی زندگی دنیا طلبی سے دور تھی، ایک بار عصر کے بعد ہم سب کو سمجھاتے ہوئے ارشاد فرمایا:

> ’’مال کی طلب میں زیادہ نہ پڑو، یہ تو دنیا ہے، جتنی قسمت میں ہے مل کر رہے گی، اس سے کم بھی نہیں ملے گی اور حرص وہوس سے زیادہ بھی نہیں مل سکتی ہے؛ اس لیے یکسوئی کے ساتھ علم میں لگے رہو!‘‘

پھر پُر جوش انداز میں ارشاد فرمایا:

> ’’سنو! میں گجراتی ہوں، جو تجارت میں بڑی مہارت رکھتے ہیں؛ لیکن میں نے علم کو ترجیح دی، اس کی وجہ سے بڑی بڑی پریشانیاں آئیں، فاقے بھی ہوئے؛ مگر پائے ثبات میں لرزہ نہیں آیا، پھر اللہ تعالیٰ نے فراوانیاں عطا فرمادیں۔‘‘

دارا و سکندر سے وہ مردِ فقیر اَولیٰ   ہو جس کی فقیری میں بُوئے اَسَدُ اللّٰہی

جب عشق سکھاتا ہے آدابِ خود آگاہی کھلتے ہیں غلاموں پر اَسرارِ شہنشاہی

ہم سب اللہ تعالیٰ کے شکر گزار ہیں کہ ایسی شخصیت کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا، جس نے اسلاف کے قصے پر مہرِ صداقت لگادی، جن کے ہر عمل کو سنت کے مطابق پایا، جن کے قریب رہ کر اندازہ ہوا کہ وہ اپنے ہر عمل کو اللہ تعالیٰ کے حضور پیش کرنے کے لائق بنانے کی محنت کررہے ہیں، خلوص وللّٰہیت کا پیکر تھے، اُن کی مثال کم از کم مجھے تو نہ ملی؛ جن کے علم کی جامعیت ایسی کہ علومِ شرعیہ کا ہر علم ہر وقت مستحضر تھا، ہر علم کو فن کی حیثیت سے پڑھا اور پڑھایا تھا:

ڈوب سا جاتا ہے دل رہ رہ کے ان کی یاد میں کوئی کیا سمجھے کہ وجہِ بےخودی ہوتی ہے کیا؟

مرحوم میں اخفائے حال بہت تھا، اپنی نیکی کسی کو نہ بتاتے تھے، حضرت رابعہ بصریہ رحمہا اللہ کا قول:

”اکتموا حسناتکم کما تکتمون سیئاتکم“.

(تم اپنی نیکیوں کو [دوسروں سے] اسی طرح چھپاؤ، جس طرح [دوسروں سے] اپنی برائیاں چھپاتے ہو!)

ہمہ وقت آپ کے پیشِ نظر ہوتا، ایک مرتبہ آپ نے اس قول کو بار بار پڑھا اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا اور فرمایا کہ ”الحمدللہ! میری حالت اور عادت ایسی ہی ہے“۔

کئی بار میں نے گزارش کی کہ حضرت اپنی ”آپ بیتی“ لکھ دیجیے، یا لکھوا دیجیے!، آپ نے اس پر توجہ نہ دی، جب بہت اصرار کیا؛ تو فرمایا: میری زندگی کیا ہے؟ کچھ بھی نہیں، میں تو اپنے اندر کچھ خوبی پاتا ہی نہیں، اگر اس پر میں کچھ کہتا: تو ”لاحول“ پڑھتے اور موضوع بدلنے کے لیے کبھی کہتے، چھوڑو اس کو، ایک مسئلہ بتاؤ، پھر کسی حدیث یا کسی آیت کے سلسلے میں سوال ڈالتے اور بالکل رُخ پھیر دیتے، کبھی فرماتے: بھائی کچھ لے آؤ کھانے کے لیے، بڑا الجھن لگ رہا ہے!

اور کبھی ارشاد فرماتے: مجھے مرنے دو پھر تعریف کرنا؛ پھر جو چاہو بولنا، لکھنا، ابھی میرا نفس خراب ہو جائے گا۔

گرت ہوا است کہ با خضر ہم نشیں باشی نہاں ز چشم سکندر چوں آبِ حیواں باش

(اگر تمھاری خواہش یہ ہے کہ خضر (علیہ السلام) کے ساتھ بیٹھو، تو آبِ حیات کی

طرح نگاہِ سکندر سے پوشیدہ رہو۔)

میرے خواجہ تاش جناب مفتی محمد مرشد قاسمی زید مجدہٗ (استاذ جامعہ مسیح العلوم، بنگلور، کرناٹک) نے ''میرے محسن میرے مرشد'' کے عنوان سے حضرت کی یاد تازہ کی ہے، اس میں موصوف نے اپنے سادہ اسلوب میں حضرت کی ان خوبیوں کو بیان کیا ہے، جواُن پر واہوئیں، حضرت کی شفقتوں، عنایتوں اور ظاہری و باطنی تربیت کی نورانی یادوں اور اداؤں کو قلم سے قرطاس کے سپرد کیا ہے، زندگی کے اسی پہلو کو ذکر کیا ہے، جو قارئین کے لیے مفید ثابت ہوں گے، ان شاء اللہ نسل نو کے لیے اصلاح وتربیت کا ذریعہ بنیں گی، موصوف نے یادوں کے نقوش اس انداز سے لکھے ہیں کہ اس کے حرف حرف میں اپنے استاذ اور مرشد کی محبت کی خوش بو پھوٹتی ہوئی محسوس ہوتی ہے اور اہلِ تعلق کے لیے مشام جاں کو معطر ومعنبر کیے بغیر نہیں رہتی، غلو اور مبالغہ آمیزی کہیں نظر نہ آئی، حضرت کی تربیت کے مطالعاتی، مضمون نگاری تصنیفی، تدریسی اور حفظِ نصوص کے پہلووں پر روشنی ڈالی ہے، ادبی اوصاف کے لحاظ سے اس پر سوانح کی تعریف اگر چہ صادق نہیں آتی؛ مگر ''خاکہ'' کی تعریف بلا تکلف صادق آتی ہے، قاری کے سامنے حضرت کی تصویر اچھی طرح واضح نظر آنے لگتی ہے، یہی کام یاب ''خاکے'' کی خوبی ہے، اللہ کرے کہ یہ ''ادب پارہ'' قارئین کی نگاہ میں مفید اور رب العالمین کی بارگاہ میں درجۂ قبول حاصل کرے، یہ ایسا ادب پارہ ہے کہ جس کو پڑھ کو خود خاکہ نگار کا دل بھی بار بار پارہ پارہ ہوتا رہے گا، اللہ تعالیٰ حضرت کو اپنی بے پایاں شان رحمت کے مطابق اجرِ جزیل عطا فرمائیں اور جنت الفردوس کے اعلیٰ مقام میں انبیا، صحابہ، صالحین اور شہدائے کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا جوار نصیب فرمائیں۔

خدا کی رحمتیں تیری لحد پہ سایہ فرمائیں ہمیشہ تیری تُربت پر فرشتے پھول برسائیں

والسلام

خاک پائے سعید

اشتیاق احمد قاسمی

(مدرس دارالعلوم دیوبند)

گیارہ بجے دن، ۲۴/ ذی القعدہ ۱۴۴۱ھ = ۱۶/ جولائی ۲۰۲۰ء

پیشِ لفظ

شارحِ مسلکِ علمائے دیوبند، ماحیٔ بدعت، امینِ علومِ سعیدی، مخلص ومہربان حضرت الاستاذ

حضرت اقدس مولانا مفتی **محمد امین صاحب پالن پوری** دامت برکاتہم العالیہ

(استاذِ حدیث وفقہ دارالعلوم دیوبند)

۲۱/شوال **۱۳۸۴**ھ کی شب کتنی سہانی اور پر کیف تھی کہ برادرِ محترم حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری رحمہ اللہ (سابق شیخ الحدیث وصدر المدرسین دارالعلوم دیوبند) نے رختِ سفر باندھا اور بھائی عبد المجید مرحوم اور احقر کو سامانِ سفر کے پاس بیٹھا کر صبح چار بجے اپنے استاذِ محترم حضرت علامہ ابراہیم بلیاوی قُدس سرہٗ کے یہاں الوداعی ملاقات کے لیے تشریف لے گئے، دولت کدہ پر پہنچ کر دستک دی، تو حضرت علامہ رحمہ اللہ خود دروازے پر تشریف لائے اور اپنے مایۂ ناز شاگرد کو رخصت کرتے ہوئے نصیحت فرمائی:

”مولوی صاحب! فن دیکھ کر پڑھانا، شرحیں دیکھ کر مت پڑھانا؛ علم آئے گا اور طلبہ کو اپنی اولاد سمجھنا؛ وہ تم سے محبت کریں گے اور سنت کی پیروی کرنا، لوگوں کے دلوں میں وقعت پیدا ہوگی۔“

برادرِ محترم حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری رحمہ اللہ نے اپنے استاذِ محترم کی مذکورہ بالا نصیحت پر پوری زندگی اس طرح عمل کیا کہ آپ سے جو کتاب متعلق ہوتی تھی؛ صرف اس کی شروحات پر اکتفا نہیں کرتے تھے؛ بل کہ پورے فن کا مطالعہ کرتے تھے، یعنی فن کی چھوٹی بڑی تمام کتابوں کا مطالعہ کرتے تھے پھر پڑھاتے تھے۔

اور آپ رحمہ اللہ کے سنتوں پر عمل کا عالم یہ تھا کہ سنن ہُدی سے آگے بڑھ کر سنن زوائد کا بھی مکمل اہتمام فرماتے، زندگی کے تمام گوشوں میں سنتوں پر عمل کرتے ہوئے نظر آتے، آپ ہمیشہ سفید لباس زیب تن فرماتے تھے، احقر نے کبھی سفید کے علاوہ دوسرے رنگ کے لباس میں ملبوس نہیں دیکھا؛

البتہ سردی کے موسم میں گرم کپڑے دوسرے رنگ کے ہوتے تھے، آپ ہمیشہ گول کرتا پہنتے تھے، جو نصف پنڈلی تک ہوتا تھا اور اِزار قدرے نیچے ہوتا تھا؛ مگر ٹخنے سے اوپر، ٹوپی گول ہوتی تھی؛ مگر بازار میں جو ٹوپیاں ملتی ہیں، ان کو استعمال نہیں کرتے تھے، گھر میں اہلیہ محترمہ کی سلی ہوئی ٹوپی پہنتے تھے، مونچھیں بالکل پست ہوتی تھیں اور ڈاڑھی ایک مشت سے قدرے زائد، اخیر عمر میں آپ پابندی سے مہندی کا خضاب کرتے تھے اور وفات تک اس پر عمل پیرا رہے، نوجوانی اور ادھیڑ عمر میں کان کی لو تک بال رکھتے تھے، جب نصف گردن تک پہنچ جاتے تھے، ترشواتے تھے، نصف گردن سے نیچے نہیں رکھتے تھے، نیز کھانے، پینے، اُٹھنے، بیٹھنے اور گفتگو میں سنت کا پورا خیال رکھتے تھے۔

حضرت والا طلبہ کو اپنی اولاد سمجھتے تھے، خاص طور پر جو طلبہ سلیم الفطرت اور ذہین ہوتے تھے، ان کا خوب خیال رکھتے تھے، ان کی تعلیم وتربیت میں کوئی کسر باقی نہیں رکھتے تھے، ان کا مالی تعاون کرتے تھے اور فارغ ہونے کے بعد ان کو اچھے مدرسے میں تدریس کے لیے بھیجتے تھے اور مدرس ہونے کے بعد بھی ان کا خیال رکھتے تھے اور ان کی ترقی کے لیے کوشاں رہتے تھے، اس کی مزید تفصیل جاننا چاہیں، تو اس کتاب کا مطالعہ کریں۔

یہ کتاب حضرت والا کے خاص خادم: جناب مولانا مفتی محمد مرشد صاحب قاسمی (استاذ جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم، بنگلور) کی ہے، موصوف نے حضرت والا کی زندگی کے مختلف واقعات اور اپنے تاثرات اس میں بیان کیے ہیں، میں نے پوری کتاب کو از اوّل تا آخر دیکھا ہے، کتاب اتنی دل چسپ اور معلومات افزا ہے کہ احقر نے ۳؍ذی قعدہ ۱۴۴۱ھ کی شب میں عشاء کے بعد اس کو دیکھنا شروع کیا، پوری رات دیکھتا رہا اور فجر کی نماز ادا کرنے کے بعد پھر دیکھنا شروع کیا اور صبح آٹھ بجے اس کو مکمل کر کے یہ ''پیشِ لفظ'' لکھ رہا ہوں، اللہ تعالیٰ طالبانِ علومِ نبوت کو اس سے استفادہ کرنے کی توفیق عطا فرمائیں اور موصوف کے لیے صدقۂ جاریہ بنائیں۔ آمین یا رب العالمین۔

محمد امین پالن پوری

خادمِ حدیث وفقہ ومرتب ''فتاویٰ دار العلوم دیوبند''

بہ روز جمعرات؛ ۳؍ذی قعدہ ۱۴۴۱ھ = ۲۵؍جون ۲۰۲۰ء

سخن گفتنی

آج اس وقت جب کہ میں اپنے محسن ومرشد، کرم فرما اور روحانی والد حضرت الاستاذ حضرت اقدس مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری رحمہ اللہ (سابق شیخ الحدیث وصدر المدرسین دار العلوم دیوبند) کے ذکرِ سعید کی سعادت مندی سے بہرہ ور ہو رہا ہوں، ۲۸؍رمضان المبارک کی شبِ جمعہ ہے، رات کا آخری پہر ہے، پونے چار بجے کا وقت ہے، آج حضرت الاستاذ کی وفات کو مکمل تین دن ہو چکے ہیں، شریعت کی رو سے بیوی کے علاوہ کسی کو بھی کسی کی وفات پر تین دن سے زیادہ غم کرنے کی اجازت نہیں؛ اس لیے باوجودے کہ اُبھی حواس مجتمع ہوئے ہیں نہ ہی اَوسان پوری طرح بحال ہوئے ہیں، رہ رہ کے آنکھوں سے آنسو جاری ہو رہے ہیں؛ مگر شریعتِ مطہرہ کے حکم کے آگے سرِ تسلیم خم کرتے ہوئے مبارک مہینے کی مبارک گھڑی میں، اپنے اس عظیم محسن کے ذکرِ جمیل کی بسم اللہ کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں، اس امید سے کہ اس بابرکت تذکرے میں مبارک مہینے اور مبارک گھڑی کی برکتیں بھی شامل ہو جائیں۔ **واللہ الموفق وھو المستعان.**

سخنہائے ناگزیر

معزز قارئینِ کرام! مناسب بل کہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ آغازِ کتاب میں ہی چند ایسی باتیں ذکر کر دی جائیں، جو آئندہ کسی بھی موقع سے پیدا ہونے والے خلجان واشکال کا جواب ہو جائیں اور قارئین کسی طرح کی کوئی پریشانی محسوس نہ کریں:

پہلی بات

یہ ہے کہ یہ رسالہ جو آپ کے ہاتھوں میں ہے، اس کے حوالے سے سب سے پہلے یہ عرض ہے

کہ یہ حضرت اقدس حضرت الاستاذ میرے محسن ومرشد مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری رحمہ اللہ، (سابق شیخ الحدیث وصدر المدرسین دار العلوم دیوبند) کی سوانح نہیں ہے، آپ کی تفصیلی اور کامل واکمل سوانح آپ کے برادرِ عزیز حضرت الاستاذ مولانا مفتی محمد امین صاحب پالن پوری (استاذِ حدیث دار العلوم دیوبند) ان شاء اللہ تحریر فرمائیں گے اور بجا طور پر آپ ہی کو یہ حق پہنچتا ہے؛ کیوں کہ آپ حقیقی بھائی ہونے کے ساتھ ساتھ چھوٹی عمر ہی سے آپ کے ساتھ رہے ہیں، آپ کے رات ودن کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، آپ کی طویل صحبت اٹھائی ہے، پوری طرح آپ کے مزاج وذوق کو سمجھا ہے، خصوصی عمومی ساری مجلسوں میں شریک رہے ہیں؛ خلاصہ یہ کہ گھر کے ایک فرد ہونے کی حیثیت سے، ایک شاگرد کی حیثیت سے، ایک مصاحب ہونے کی حیثیت سے جتنا کچھ آپ نے دیکھا، سمجھا، اخذ کیا ہے، ظاہر ہے اتنا کسی کو بھی نصیب نہیں؛ لہٰذا حضرت کی لکھی ہوئی ساری باتیں قابلِ اعتماد ہوں گی اور نہ جانے کیسی کیسی قیمتی باتیں اس میں موجود ہوں گی؛ اس لیے حضرت الاستاذ کی مکمل سوانح عمری پڑھنے کے لیے قارئین حضرت الاستاذ مفتی محمد امین صاحب پالن پوری زید مجدہم کی تحریر کا انتظار کریں۔

''دیر آید درست آید''

دوسری بات

یہ کہ میری یہ تحریر، اس وقت سوشل میڈیا پر حضرت ممدوح کے متعلق گشت کرنے والی تحریر سے بھی مختلف ہے، جن میں بالعموم ایک ہی طرح کی بات پائی جاتی ہے، مثلاً یہ کہ آپ گجرات کے کس گاؤں میں پیدا ہوئے؟ آپ کے والد اور دادا کا نام کیا تھا؟ مکتب میں کتنی سال کی عمر میں گئے؟ ابتدائی تعلیم کہاں اور کب تک حاصل کی؟ آپ کے ابتدائی اساتذہ کا نام کیا ہے؟ مظاہرِ علوم میں کس سن میں داخلہ ہوا؟ وہاں کتنے سال تعلیم حاصل کی؟ کون سی کتابیں کن اساتذہ سے پڑھیں؟ دار العلوم میں کب داخلہ لیا؟ وہاں کتنے سال تعلیم حاصل کی؟ دورۂ حدیث شریف کے سال آپ کا نمبر کتنا آیا؟ افتا کس سال کیا؟ تدریس کا آغاز کب سے اور کہاں سے فرمایا؟ وہاں آپ کے زیرِ درس کیا کتابیں رہیں؟ دار العلوم میں کب آپ کا تقرر ہوا؟ کتنے سال تدریسی خدمات انجام دیں؟ کیا

کیا کتابیں آپ سے متعلق رہیں؟ آپ پڑھاتے کیسا تھے؟ تفہیم کا انداز کیسا تھا؟ آپ کی جملہ تصانیف کتنی ہیں؟ ان سب کے نام کیا کیا ہیں؟ عربی میں کتنی اور اردو میں کتنی ہیں؟ آپ کی اولاد کتنی ہیں؟ بیٹوں اور بیٹیوں کی کیا تفصیل ہے وغیرہ۔

اس لیے کہ اولاً: یہ ساری چیزیں آپ کی وفات کے فوراً بعد اگلے ہی دن سے؛ بل کہ اگر یہ کہہ دوں کہ آپ کا جنازہ اُٹھنے سے بھی پہلے سے سوشل میڈیا پر رات دن گشت کر رہی ہیں، تو کوئی مبالغہ نہ ہوگا، بعض لوگوں کو تو یہاں تک دیکھا کہ آپ کی وفات کی خبر ملتے ہی فوراً ''واٹس ایپ'' پر اپنا مضمون وائرل کرنے لگ گئے، ایسا محسوس ہوا جیسا کہ وہ مضمون لکھ کر اسی انتظار میں بیٹھے تھے کہ کب آپ کی وفات ہو اور اپنا مضمون عام کر کے ان کے قلب مضطر کو قرار آجائے، ان کی طویل بے چینی کو سکون مل جائے، ہائے افسوس! حضرت الاستاذ کے حادثے سے پورے عالمِ اسلام پر قیامت ٹوٹ پڑی، خصوصی تعلق رکھنے والوں کے علاوہ عمومی تعلق رکھنے والے بہت سے لوگوں کے لیے بھی اپنے آپ پر قابو رکھنا دشوار ہو گیا، دیو بندیت یتیم ہو گئی؛ مگر ایسے وقت میں بھی کچھ لوگوں کو بس اپنے نام کی فکر لگی رہی!!

ثانیاً: اس لیے کہ راقم کے پیشِ نظر اس تحریر سے جو بنیادی چیزیں ہیں، وہ ہیں حضرت ممدوح کی زندگی کے ان پہلوؤں کو اپنی وسعت کے بہ قدر پیش کرنا، جن سے ہم بعد والوں کو کوئی سبق مل رہا ہو۔

ثالثاً: آپ کی شفقتوں اور محبتوں کے نتیجے میں دل کے اندر جنم لینے والے احساسات اور تأثرات کو الفاظ کا جامہ پہنانا، نہ کہ آپ کی مکمل سوانح لکھنا۔

اسی لیے میں نے اپنی اس تحریر کا نام بھی روایتی انداز کا مثلاً ''آہ حضرت الاستاذ''، ''ہاں! میں مفتی سعید احمد ہوں''، ''ایک اور ستارہ غروب ہوا''، ''ایک چراغ اور بجھا'' وغیرہ نہیں رکھا؛ بل کہ حضرت اقدس حضرت الاستاذ نے میری تعلیم و تربیت، اصلاحِ نفس اور دنیاوی و اخروی زندگی کی کام یابی و کام رانی کے لیے ہر وقت اور ہر موقع پر جو کوششیں اور راہ نمائی فرمائی، زندگی کی پُرخار وادیوں میں جس خوش اسلوبی سے آبلہ پائی سے بچایا، شیر خوار بچوں کی طرح انگلی پکڑا کر چلایا، ہماری زندگی کی راہوں کے کانٹوں کو اپنے ہاتھوں سے ہٹا کر پھول بچھایا، کسی بھی طرح کی پریشانی ہو، اسے سن کر

ایک مشفق ومہربان باپ کی طرح فکرمند ہو گئے اور نہ صرف یہ کہ صرف فکرمند ہوئے؛ بل کہ اس سے نکالنے کی فوری کوشش فرمائی اور نکال کر دم لیا، غرضے کہ تمام دینی و دنیوی امور میں آپ نے بلا مبالغہ ایک مشفق ومہربان باپ سے بھی آگے بڑھ کر ہاتھ تھاما اور صحیح راہ دکھائی؛ ان تمام تر شفقتوں اور محبتوں کے نتیجے میں میرے قلب وذہن میں جو احساسات اور تأثرات موجود ہیں، صرف اُنھیں الفاظ کا جامہ پہنا کر سینۂ قرطاس پر لانے کی ایک ادنیٰ کوشش کی ہے۔

ساتھ ہی آپ کی عمومی وخصوصی مجلسوں میں بکھیری جانے والی کچھ نایاب موتیاں بھی ہیں، جنھیں اس ناکارے نے اپنے دامن میں بہ راہِ راست سمیٹنے کی کوشش کی ہے، اسے بھی شامل کر دیا گیا ہے؛ تاکہ یہ ہماری زندگیوں میں ہمارے لیے مشعلِ راہ ہو جائیں۔

تیسری بات

کتاب کے قارئین مختلف مزاج وذوق کے ہوتے ہیں، بعض کسی غلطی پر واقف ہوتے ہیں، تو چشم پوشی کرتے ہوئے از راہِ شفقت معاف فرما دیتے ہیں اور بعض اصولی طور پر گرفت فرما لیتے ہیں، جن کا اُن کو حق پہنچتا ہے، اسی ذہنیت کو سامنے رکھ کر ایک اور بات کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے، وہ یہ کہ ہوسکتا ہے کہ بہت سے قارئین کو یہ اشکال ہو جائے کہ مؤلف نے اپنا تذکرہ اتنا زیادہ کیوں کیا ہے؟ اس ہونے والے سوال کا جواب ملاحظہ فرمالیں:

معزز قارئینِ کرام! مقصود تو حضرت والا ہی کی شفقتوں اور محبتوں کو ذکر کرنا ہے؛ مگر انھیں اگر میں سیاق وسباق سے کاٹ کر، واقعے کے تناظر سے صرفِ نظر کر کے ذکر کرتا، تو شاید آپ کی شفقتیں ومحبتیں اس درجے میں کھل کر سامنے نہ آپاتیں، جس درجے میں راقم چاہ رہا تھا؛ اس لیے ہر موقع کے واقعے کو قدرے تفصیل سے ذکر کرتا رہا۔

بہ طور مثال یہ سمجھیں کہ میں نے اپنی اس کتاب میں ''عون الغفار کی تالیف'' کا ایک عنوان لگایا ہے اور اسے تفصیلاً لکھا ہے، اس کتاب کی تالیف کے پورے سفر میں آغازِ سفر سے لے کر انتہائے سفر تک آپ نے انگلی پکڑا کر چلایا، تالیف کا یہ سفر مکمل ہونے تک آپ نے مجھے پوری طرح تھام کر رکھا،

قدم قدم پر راہ نمائی اور حوصلہ افزائی فرمائی، اسے تفصیلی طور پر لکھنے کے بجائے اگر صرف یوں لکھ دیا جاتا کہ ''اِس کتاب کی تالیف میں آپ نے بڑی مدد فرمائی'' یا یہ کہ ''آپ پوری طرح توجہ فرماتے رہے'' یا یہ کہ ''یہ جو کچھ ہوا، آپ ہی کی برکت سے ہوا'' یا یہ کہ ''یہ آپ ہی کا فیض ہے'' وغیرہ، تو پھر ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں حضرت والا نے تدریجاً جو اپنے مخصوص انداز میں پوری فکرمندی کے ساتھ اس مشکل سفر کو بہ آسانی طے کرا کر منزلِ مقصود تک پہنچایا، کیا حضرت کی ایسی فکرمندی اور تڑپ ایک چھوٹے سے جملے میں پوری طرح واضح ہو جاتی، ظاہر ہے کہ بالکل نہیں ہوتی؛ اس لیے نہ چاہتے ہوئے اور قارئینِ کرام کے لیے بارِ خاطر ہونے کے احساس کے باوجود بھی، میں نے یہ غلطی کرلی ہے؛ ورنہ ''من آنم کہ من دانم''؛ لہٰذا یہ چیز تو یقیناً آپ کے لیے باعثِ اکتاہٹ ہوگی اور جو قارئین نازک طبیعت و مزاج رکھتے ہیں، ان کے لیے تو باعث اذیت بھی ہوگی؛ اس لیے آپ کی خدمت میں پیشگی معذرت و وضاحت ہے، امید ہے کہ اس خون کے گھونٹ کو پی کر دامنِ عفو میں جگہ دیں گے۔

بس اس تحریر کو پڑھتے ہوئے آپ ہمہ وقت یہ تصور جمائے رکھیے کہ میں (قاری) سنگریزوں میں ہیرے تلاش کر رہا ہوں، آپ ہی بتائیں کہ اگر کوئی شخص ہمارے سامنے سنگریزوں کی ایک بوری خالی کر دے اور کہے کہ اس میں ہیرے بھی ہیں، تلاش کرلو، تو کیا ہم یہ کہہ کر چھوڑ دیں گے کہ ہیرے سنگریزوں کے درمیان ہیں؛ لہٰذا ہم تلاش نہیں کریں گے، یا یہ کہ ہم ہیروں کی تلاش میں فوراً سنگریزوں کو بھی اپنے ہاتھوں سے اٹھا اٹھا کر اور پلٹ پلٹ کر دیکھیں گے، ظاہر ہے کہ یہی کریں گے؛ لہٰذا آپ اس ناکارے کے تذکرے کو اس تحریر میں بالکل سنگریزے کی طرح سمجھیں اور آپ نے جو کچھ فرمایا یا عملاً کیا، اسے ہیرا سمجھیں اور یہ بھی مسلمات میں سے ہی ہے کہ قیمتی چیز کم ہوتی ہے، چناں چہ سنگریزے آپ کو ہر جگہ بہ آسانی بڑی مقدار میں مل جائیں گے؛ لیکن ہیرا تو بہت مشکل سے اور بہت کم حاصل ہوگا؛ اس لیے میرے ذاتی تذکرے کی مقدار اگر زیادہ ہوئی، تو یہ بھی دلیل اس بات کی ہے کہ یہ سنگریزے ہیں، جو بہت نظر آرہے ہیں، لہٰذا آپ حضرات صرف ہیرے کی تلاش و جستجو پر نگاہ رکھیں، اللہ پاک ہم سب کو آپ ہی کی طرح پوری زندگی اپنے مبارک دین کی خدمت میں

لگائے رکھے، آمین۔

چوتھی بات

یہ ہے کہ اپنی اس تحریر میں حتی الامکان اس بات کی بھرپور کوشش کی ہے کہ جو بھی واقعہ یا آپ کا قول وعمل ذکر ہو، اس سے ہم چھوٹوں کو کوئی نہ کوئی سبق مل رہا ہو؛ لہٰذا یہ مجموعہ جو آپ قارئین کے ہاتھوں میں ہے، وہ آپ کی زندگی کے بہت سارے واقعات اور آپ کی مبارک مجلسوں کے بہت سارے ارشادات سے منتخب کر کے پیش کیے جا رہے ہیں اور بہت خاص بات یہ ہے کہ اس مجموعے کی تمام باتیں صرف ایک واقعے کو چھوڑ کر وہ ہیں، جنھیں راقم نے حضرت الاستاذ کی فیضان بخش مجلس اور بابرکت صحبت سے بہ راہِ راست حاصل کی ہیں، کسی طرح کا کوئی واسطہ نہیں اور آپ کے مزاج و مذاق کا بھرپور خیال رکھ کر اپنی وسعت کی حد تک کسی بھی واقعے کو نقل کرنے میں ادنیٰ مبالغے سے بھی کام نہیں لیا ہے، من وعن نقل کرنے کی کوشش کی ہے۔

اخیر میں میں اپنے ان تمام بڑوں، مخلصوں اور مشفق و مہربان اساتذۂ کرام کا بے انتہا شکر ادا کرتا ہوں، جنھوں نے اس ناکارے کی درخواست کو شرفِ قبولیت بخش کر اپنے قیمتی تاثرات سے نوازا، اس ناکارے کی حوصلہ افزائی فرما کر اپنے مفید مشورے سے بھی مستفید ہونے کا موقع عنایت فرمایا۔

ساتھ ہی اپنے ان تمام بھائیوں کا بھی بے حد ممنونِ احسان ہوں، جنھوں نے اس کتاب کو آخری مرحلے تک پہنچانے میں قدم قدم پر میری مدد فرمائی۔ **فجزاهم الله تعالى عني خير الجزاء.**

اس ضروری وضاحت کے بعد اب ہم اپنے مقصد کی طرف لوٹتے ہیں اور پہلے آپ کی محبتوں اور شفقتوں کے سلسلے کا آغاز کرتے ہیں:

وہ مقناطیس کیا تھا؟

تقریباً دس سال تک الحمدللہ، اللہ پاک نے محض اپنے فضل وکرم سے یہ موقع نصیب فرمایا کہ

حضرت اقدس کی سرپرستی اس ناکارے کو حاصل رہی اور ایک بالکل اپنی اولاد کی طرح چھوٹے سے چھوٹے اور بڑے سے بڑے معاملے میں آپ ہر وقت راہ نمائی فرماتے رہے - **فجزاه الله تعالیٰ عني خير الجزاء** - حضرت والا کی جو اتنی شفقت مجھے حاصل ہوئی، اس کا سلسلہ کیسے شروع ہوا؟ اس کا اصل محرک کیا تھا؟ جس نے مجھے آپ کے قدموں میں لا کر ڈال دیا اور میں نے طالبِ علمی کے لاشعوری دور میں یہ فیصلہ کر لیا کہ اب کچھ بھی ہو جائے، میں آپ کے در کو نہیں چھوڑوں گا، تو ملاحظہ فرمایئے اس سلسلے کے تین واقعے:

پہلا واقعہ

۲۰۰۸/۲۰۰۹ء میں جب راقم دورۂ حدیث شریف میں داخل ہوا، تو حضرت الاستاذ کے یہاں ''بخاری شریف'' اور ''ترمذی شریف'' کی عبارت جن طلبہ کو پڑھنی تھی، ان میں راقم کا بھی نام تھا؛ کیوں کہ الحمدللہ ہفتم کے سال اس ناچیز کو اللہ پاک نے حضرت الاستاذ حضرت مولانا عبد الحق صاحب اعظمی رحمہ اللہ اور حضرت الاستاذ حضرت مفتی محمد امین صاحب پالن پوری زید مجدہم کے درسِ ''مشکاۃ'' میں بالترتیب جلدِ اول و جلدِ ثانی میں خوب کثرت سے عبارت خوانی کا موقع نصیب کیا تھا؛ اس لیے دورۂ حدیث شریف کے سال حضرت الاستاذ کے یہاں نام آ گیا؛ مگر آپ کے یہاں عبارت خوانی کا عمل کس قدر مشکل ہوتا تھا، اس کو دورۂ حدیث شریف میں موجود طلبہ، خاص کر عبارت خواں ہی صحیح طور پر سمجھ سکتے تھے، چناں چہ قاریٔ عبارت کی خوب اصلاح حضرت الاستاذ کے سبق میں ہوتی رہتی تھی، چناں چہ ایک دن ''بخاری شریف'' کے سبق میں میرے ایک اچھے ساتھی جو بڑی اچھی عبارت پڑھتے تھے (مگر حضرت الاستاذ کے یہاں ان کی بھی اصلاح ہوتی رہتی تھی) اُنھیں حضرت نے خوب ڈانٹ پلائی، اسی دن مغرب کے بعد ''ترمذی تشریف'' کی عبارت مجھے پڑھنی تھی، حضرت الاستاذ کا علمی رعب تو ہمہ وقت یوں ہی طاری رہتا تھا اور اس دن صبح کے واقعے کے پیشِ نظر اور بھی حالت خراب تھی اور عجیب طرح کی گھبراہٹ طاری تھی کہ پتہ نہیں صبح

جب ایسے اچھے ساتھی کا یہ حشر ہوا ہے، تو پھر مجھ ناکارے کا پتہ نہیں کیا ہوگا؟ خیر! اللہ، اللہ کر کے مغرب بعد کا وقت آیا، حضرت الاستاذ مسندِ درس پر تشریف فرما ہوئے اور کانپتے لرزتے ہاتھوں سے میں نے مائک اپنی طرف کر کے بٹن آن کیا اور ڈرتے ڈرتے بسم اللہ اور باب کا عنوان بڑی احتیاط سے اور صاف پڑھنے کی کوشش کی اور شاید باب کا عنوان صاف پڑھنے میں کامیاب ہوگیا؛ مگر اب انتظار تھا اس کا کہ حضرت اللہ جانے کیا فرماتے ہیں اور خوف کی انتہا نہ تھی؛ مگر گمان کے خلاف آپ نے میرے بسم اللہ پڑھنے کے بعد فرمایا کہ ''یہ طالب علم پڑھتا ہے، تو ایک ایک لفظ سمجھ میں آتا ہے، باقی پڑھتے ہیں، تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا، صرف مجھے پریشان کرتے ہیں''؛ آپ کا یہ جملہ میرے حق میں کتنا بڑا تھا اور کتنا حوصلہ افزا تھا، اسے بیان کیسے کیا جائے؛ مگر اس کی لذت آج بھی محسوس ہوتی ہے اور اس کے بعد بعض مخلص ساتھیوں نے مشورہ دیا کہ حضرت تجھ سے محبت کرتے ہیں، آپ کی مجلس میں جایا کرو اور میں نے ایک حد تک ساتھیوں کے اس مخلصانہ مشورے پر عمل بھی شروع کر دیا۔

دوسرا واقعہ

پہلے واقعہ سے بھی بالکل عجیب وغریب ایک دوسرا واقعہ پیش آیا: ہوا یوں کہ دورۂ حدیث شریف کے سال کے بعد سالانہ چھٹی گزار کر شوال میں جب میں دارالعلوم پہنچا، اس وقت نئے طلبہ ہی کی کارروائی چل رہی تھی، چناں چہ میں یوں ہی ایک دن صبح کے وقت صدر دروازے کے باہر نکلا، تو دیکھا کہ سامنے سے حضرت الاستاذ تشریف لا رہے ہیں، دور ہی سے سلام کر کے میں آپ کے راستے سے ہٹنے لگا اور ذرا دور ہونے لگا؛ مگر جب آپ قریب ہوئے، تو میں نے دیکھا کہ آپ صدر دروازے میں داخل ہونے کے بجائے میری طرف متوجہ ہو چکے اور مصافحہ کے لیے ہاتھ آگے کر چکے ہیں؛ اللہ اکبر! اس وقت کی کیفیت تو مجھے یاد نہیں، بس اتنا یاد ہے کہ میں فوراً آپ کی طرف لپکا اور عقیدت کے ساتھ مصافحہ کیا، آپ نے پوچھا گھر سے آگئے؟ میں نے جواب دیا: جی ہاں، بس آپ

تشریف لے گئے ؛مگراب مجھ پرایسالگا کہ سکتہ طاری ہوگیا، میں بالکل کھوسا گیا،سوچنے لگا کہ یہ حقیقتاً ہوا ہے یا یہ کہ میں تصور میں ہوں، آس پاس چل رہے طلبہ میں سے بھی جس کی نگاہ پڑی، وہ محوِ حیرت، میں خودمحوِ حیرت کہ اتنے بڑے عظیم انسان، دارالعلوم کے شیخ الحدیث وصدرالمدرسین نے اپنے ایک معمولی سے معمولی طالبِ علم سے اتنا پیار کیا، اس واقعے نے بھی آپ کی محبت وشفقت کے ایسے انمٹ نقوش دل پر ثبت کردیے ہیں کہ اسے کسی بھی طرح کھرچا نہیں جاسکتا (ان شاءاللہ)۔آج دس بارہ سال بعد بھی جب یہ واقعہ یاد آتا ہے،تو تھوڑی دیر کے لیے تصور کی دنیا میں چلا جاتا ہوں اور سوچنے لگتا ہوں کہ کیاواقعی ایسا ہوا تھا، قارئین! آپ شک میں نہ پڑیں واقعی ایسا ہوا تھا۔

تیسرا واقعہ

دورۂ حدیث شریف کے بعد ایسے دوواقعے پیش آجانے کے بعد بھی فوراً یہ (راقم) دل ودماغ کا اندھا، اس جلتی شمع کا پروانہ نہ بن سکا اور لمبے لمبے وقفے سے کبھی کبھار مجلس میں حاضر ہوتا اور مارے رعب کے پیچھے ہی بیٹھ کر واپس آجاتا، اس طرح ایک لمبا عرصہ سال ڈیڑھ سال کا گزرگیا، ایک دن اچانک دل میں عجیب طرح سے آپ کی محبت جوش مارنے لگی اور ماضی کی باتیں اور شفقتیں بھی خوب یاد آنے لگیں اور رونا بھی آنے لگا، چناں چہ اسی کیفیت کے ساتھ آنکھوں میں آنسو لیے ہوئے خلافِ معمول بالکل عصر سے پہلے ہی آپ کے گھر پہنچ گیا، دیکھا کہ آپ نماز کے لیے اتر رہے ہیں، دیکھتے ہی فرمایا کہ ’’تم دارالعلوم میں ہو؟ میں تو سوچ رہا تھا کہ تم چلے گئے‘‘، اتنا سننا تھا کہ آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی، سسکتے سسکتے پیچھے پیچھے چلنے لگا، اپنے آپ کو ملامت بھی کرنے لگا کہ اتنے لمبے عرصے سے دارالعلوم میں رہتے ہوئے تو نالائق حاضر نہ ہوا اور حضرت اب تک یاد رکھے ہوئے ہیں ؛ یہ بس آخری موقع تھا، اب آنکھ کھل چکی تھی، طے کرلیا کہ اب کچھ بھی ہوجائے، آپ کے در کو نہیں چھوڑوں گا، چناں چہ اس دن سے پوری پابندی سے آپ کی مجلس میں حاضر ہونے لگا اور آپ کی علمی وروحانی مجلس میں بکھیرے جانے والے قیمتی موتیوں کو اپنے دامن میں سمیٹنے لگا۔

تم افتا کرلو!

حضرت الاستاذ کی خدمت میں حاضری اب مسلسل ہو رہی تھی، ہوتے ہوتے جب میرے تخصص فی الحدیث کا دوسرا سال آیا، تو سالانہ امتحان سے کچھ پہلے آپ نے فرمایا کہ تم نے تخصص فی الحدیث کرلیا ہے، اب افتا کرلو، پھر تمھیں اندازہ ہوگا کہ کون سا فن زیادہ وسیع ہے (حدیث یا فقہ)؟ آپ کے اس جملے کو سن کر دل بہت بڑا ہوا، بڑا حوصلہ ملا؛ مگر دارالعلوم میں شعبۂ افتا میں داخلہ کس قدر مشکل ہے، اس کا صحیح ادراک وہی طالبِ علم کرسکتا ہے، جو داخلے کا متمنی ہوتا ہے، اس کے پیشِ نظر میں نے عرض کیا، حضرت نمبرات کے لیے دعا فرما دیجیے، آپ نے فرمایا: ''جی دعا کریں گے، ان شاءاللہ!''۔

حفظِ حدیث کے نمبرات میں اضافہ

آپ کے مشورے کے بعد، میں نے افتا کا پختہ ارادہ کرلیا، تیاری مزید شروع کردی، تخصص فی الحدیث کے میرے دیگر چار ساتھیوں کا بھی افتا کا ارادہ تھا، چناں چہ ایک دن یہ بات سامنے آئی کہ حفظِ حدیث کا امتحان چوں کہ تقریری ہوتا ہے؛ اس لیے اس کا کل نمبر نوے (۹۰) ہی ہے؛ کیوں کہ تمام کتابوں کے کل نمبرات دارالعلوم میں دراصل نوے ہی ہوتے ہیں، باقی دس میں سے چھ نمبر عربی میں پرچہ لکھنے اور چار نمبر خوش خطی کے ہوتے ہیں اور ظاہر ہے کہ تقریری امتحان میں جب کہ وہ بھی صرف حفظ کا ہو، عربی میں پرچہ لکھنے اور خوش خطی کا کیا سوال؟ چناں چہ ہم تمام ساتھیوں کو یہ فکر لاحق ہوئی کہ افتا میں داخلہ تقابل سے ہوتا ہے اور ہمارے نمبرات اس ایک کتاب میں صرف نوے ہیں، اگر پورا نوے نمبر آ بھی جاتا ہے، تب بھی ہم دس نمبر پیچھے رہ جائیں گے اور اس طرح ہم پورے نمبر لاکر بھی پیچھے رہ جائیں گے، چناں چہ ساتھیوں نے کہا کہ تم حضرت کے پاس آتے جاتے ہو؛ لہٰذا ہم سب کی اس پریشانی کا تذکرہ حضرت سے کرو، ہوسکتا ہے حضرت کوئی حل نکال دیں، میں نے موقع نکال کر آپ سے یہ ساری پریشانیاں بتائیں، اس پر آپ نے مشورہ دیا کہ تمھاری بات درست ہے؛ لہٰذا تم تمام ساتھی مل کر حضرت مہتمم صاحب کو درخواست دو، مجلسِ تعلیمی اس پر غور کرے گی، آپ کے

مشورے کے مطابق ایسا ہی کیا گیا اور الحمد للہ مجلسِ تعلیمی نے غالباً خوش اِلحانی اور لب و لہجے کی عمدگی کے دس نمبر مقرر کردیے، جو مجموعہ اب سو (۱۰۰) ہوگیا، ہم نے راحت کی سانس لی، آگے چل کر امتحان کے بعد ہم تمام ساتھیوں کا اتنا نمبر آیا کہ سب کے سب کا داخلہ بہ آسانی شعبۂ افتا میں ہوگیا۔

میں نے تمھارا نمبر معلوم کرلیا ہے

تخصص فی الحدیث سالِ دوم کے سالانہ امتحان کے بعد اگر کسی چیز کا بے صبری سے انتظار تھا، تو وہ تھا سالانہ امتحان کا نتیجہ؛ کہ افتا کا داخلہ اسی پر موقوف تھا، بالعموم پندرہ رمضان المبارک سے دار العلوم میں سالانہ امتحان کے نتائج جماعتوں کے اعتبار سے بالترتیب آنا شروع ہوجاتے ہیں، بیس بائیس تک تقریباً مکمل ہوجاتا ہے، اس سال اتفاق کچھ ایسا ہوا کہ تکمیلات کی جماعت کے نمبرات آنے میں قدرے تاخیر ہوئی، سلسلہ پچیس رمضان تک جا پہنچا، گرچہ تاخیر بہت زیادہ نہیں تھی؛ مگر ایک بڑے ہدف کو پانا اسی نتیجے پر موقوف تھا؛ اس لیے معمولی تاخیر بھی بہت زیادہ معلوم ہورہی تھی اور نمبرات کا انتظار بڑی بے صبری سے تھا، خیر ''دیر آید درست آید'' الحمد للہ جب نتیجہ آیا، تو اپنے ساتھیوں میں دوسری پوزیشن کے ساتھ ترانوے پوائنٹ پچھتر (۹۳٫۷۵) تھا، جو حکماً چورانوے (۹۴) ہوتا ہے اور یہ نمبر ''مہاراشٹر'' کے تمام طلبہ میں سب سے زیادہ تھا، اگر پورے ''مہاراشٹر'' سے صرف ایک طالب علم کا شعبۂ افتا کے لیے انتخاب ہوتا، تو بھی نمبرات کی زیادتی کی بنیاد پر اس ناکارے کا ہی ہوتا؛ اس لیے نمبرات کو دیکھ کر تو خوشی کی انتہا نہ رہی، سب سے پہلے تو خیال یہی ہوا کہ فوراً حضرت الاستاذ کو یہ خوش خبری سناؤں؛ کیوں کہ بہ ظاہر افتا کا داخلہ یقینی ہوچکا تھا؛ لیکن خیال آیا کہ ہوسکتا ہے ابھی مصروف ہوں یا آرام کررہے ہوں؛ اس لیے عصر بعد کے وقت کا انتظار کرنے لگ گیا، جیسے ہی عصر کی نماز سے فراغت ہوئی اور اطمینان ہوا کہ اب آپ فارغ ہوں گے، تو نمبرات کی اطلاع کے لیے میں نے فون لگایا، جیسے ہی آپ نے فون اٹھایا اور میں نے سلام کرکے اپنا نام بتایا، فوراً آپ نے فرمایا کہ ''میں نے تمھارا نمبر معلوم کرلیا ہے، ماشاء اللہ بہت اچھا نمبر ہے''، میں نے یہ کہہ کر کہ ''حضرت

آپ ہی کی دعاؤں کا نتیجہ ہے'' فون رکھ دیا؛ مگر حیرت واستعجاب کے سمندر میں بالکل ڈوب گیا کہ اپنے اتنے معمولی شاگرد کا آپ اتنے بڑے اور اتنے مصروف ہوکر اس درجے خیال فرمارہے ہیں۔

قارئینِ کرام! اس واقعے کو پڑھ کر آپ خود بتائیں کہ اپنے اِس محسن کی محبت کا دل پر کیسا گہرا اثر پڑے گا؟! بات صرف اتنی تو نہیں کہ کسی طالبِ علم کے ذریعے میرا نمبر معلوم کرائے؛ بل کہ بات یہ ہے کہ میرے افتا میں داخلے کی آپ کو کس قدر فکر تھی، اس واقعے نے تو یہ محسوس کرایا کہ خود مجھ سے بھی زیادہ ان کو فکر تھی۔**فجزاه الله تعالیٰ عني خير الجزاء**

نوٹ!

یہاں ایک بات قابلِ وضاحت یہ ہے کہ بہت سے لوگوں کے علم میں یہ بات ضرور ہوگی کہ حضرت الاستاذ لوگوں کے چاہنے کے باوجود طلبہ کے تعلیمی نقصان سے بچتے ہوئے ایامِ تعلیم میں حتی الامکان سفر نہیں کرتے تھے، ہاں کوئی ضروری سفر پیش آجاتا تو اور بات؛ اسی لیے آپ تعطیل کے ایام میں رمضان المبارک میں امریکہ، لندن یا کنیڈا وغیرہ کے دینی واصلاحی سفر پر ہوا کرتے تھے؛ لیکن آج سے سات سال پہلے جس سال میں نے تخصص فی الحدیث سال دوم مکمل کر کے افتا میں داخلہ لیا تھا، اس شوال سے پہلے جو رمضان گزرا تھا، اس میں آپ بروقت ویزے وغیرہ کی کارروائی نہ ہونے یا ایسے ہی کسی کاغذی کارروائی مکمل نہ ہونے کی وجہ سے باہر نہیں جا سکے تھے اور آپ کا قیام اس سال رمضان میں دیوبند ہی میں تھا؛ اس لیے میں نے فون کرلیا اور بہ آسانی بات ہوگئی۔

''عقود رسم المفتي'' حفظ کرانا

سالانہ چھٹی گزار کر شوال میں جب میں دارالعلوم پہنچا، تو حضرت الاستاذ نے فرمایا کہ بھائی! نمبرات کے اعتبار سے تو داخلہ یقینی ہے؛ مگر ابھی تو نئے طلبہ کی ہی کارروائی چل رہی ہے، شعبۂ افتا کے داخلے اور پھر اس کی جملہ کارروائی مکمل ہونے تک تو ابھی کافی وقت لگے گا، لہٰذا وقت یوں ہی گزارنے کی ضرورت نہیں، داخلہ اپنے وقت پر ہوتا رہے گا، ابھی تم یہ کام کرو کہ علامہ شامی رحمہ اللہ کی

کتاب ’’شرح عقود رسم المفتي‘‘ سے ’’عقود رسم المفتي‘‘ جو چوہتر اشعار کا مجموعہ ہے، (جس میں علامہ شامی رحمہ اللہ نے اصولِ فتاویٰ کو نہایت ہی جامعیت کے ساتھ ذکر کر دیا ہے، پھر خود ہی اس منظومے کی شرح فرمادی ہے، جس کا نام ’’شرح عقود رسم المفتي‘‘ ہے) اُسے الگ کاپی پر لکھ کر یاد کرنا شروع کردو، آپ کے اس مشورے پر عمل کرتے ہوئے چند دنوں میں اِن تمام اشعار کو یاد کرکے سنادیا، پھر آپ نے کہا اسے اب تھوڑا تھوڑا کرکے کاپی پر الگ سے لکھ لو اور ترجمے کے ساتھ مختصراً تشریح لکھ کر دکھاؤ، فوراً یہ کام بھی شروع کر دیا، الحمدللہ شعبۂ افتا میں داخلے سے پہلے ہی حضرت نے گھر پر مکمل اشعار (عقود رسم المفتي) یاد کرا کر ترجمہ وتشریح ضرورت کے بہ قدر سب کروادی اور یہ پورے اصول جو اشعار میں مذکور تھے، خوب اچھی طرح ذہن نشین ہوگئے، اس کام کے مکمل ہونے کے بعد آپ نے فرمایا کہ ’’ہمارے افتا کے زمانے میں بس یہی ایک کتاب (شرح عقود رسم المفتی) پڑھائی جاتی تھی، باقی پورا وقت طلبہ کا تمرین فتاویٰ میں صرف ہوتا تھا، وہ بھی اس طرح کہ استاذ سوالات نہیں لکھاتے تھے؛ بل کہ طالبِ علم حضرت مفتی صاحب (حضرت مولانا مفتی سید مہدی حسن صاحب رحمہ اللہ) سے کوئی استفتا اپنی سہولت کے اعتبار سے لے لیتا اور اس کا جواب اپنی کاپی میں لکھ کر لاتا، حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ ہر لحاظ سے اس کی اصلاح فرماتے، زبان کے لحاظ سے بھی اور جواب کی صحت کے لحاظ سے بھی، اس اصلاح کے بعد طالبِ علم اسے استفتا والے اصلی کاغذ پر اپنے دستخط کے ساتھ صاف لکھ کر لاتا اور حضرت مفتی صاحب کے تصویبی دستخط سے وہ فتویٰ روانہ کیا جاتا۔

نوٹ!

افتا کے نصاب اور طریقۂ تمرین وغیرہ سے متعلق حضرت والا کی ہدایات حضرت مولانا مفتی محمد طاہر صاحب مدظلہ (مفتی مظاہرِ علوم (وقف) سہارن پور) کی کتاب: ’’عقود الجواهر شرح الأشباه و النظائر‘‘ میں حضرت کی تقریظ میں موجود ہے، نہایت ہی قابلِ توجہ ہے، اصحابِ افتا کو وہ

تحریر ملاحظہ کرنی چاہیے۔

کیسے نہ کہوں کہ وہ ایک مشفق ومہربان والد کی طرح تھے!!

نمبرات کی بنیاد پر تو الحمد للہ حسب ضابطہ شعبۂ افتا میں داخلہ ہوگیا، منتخب طلبہ کی جو فہرست آویزاں کی گئی، ان میں نام آگیا، عصر بعد جب حضرت والا کے یہاں حاضری ہوئی، تو آپ نے بھی مبارک باد دی اور فرمایا کہ تمھارا نام منتخب کرلیا گیا، مہاراشٹر کے طلبہ میں سب سے زیادہ تمھارا ہی نمبر تھا؛ خیر! جیسے ہی شعبۂ افتا میں داخلہ ہوا اور جیسا کہ اَبھی اوپر عرض کیا کہ آپ کے نزدیک افتا کے سال طلبہ کے لیے تمرین فتاویٰ ہی سب سے زیادہ ضروری واہم تھا، اسی کے پیشِ نظر حضرت الاستاذ نے مجھے مفتی اشتیاق احمد صاحب (استاذ دارالعلوم دیوبند) کے ساتھ حضرت مفتی حبیب الرحمان صاحب خیر آبادی، جو دارالعلوم کے دارالافتا کے سب سے قدیم وتجربے کار اور ماہر مفتی ہیں، ان کے پاس بھیجا اور مفتی اشتیاق احمد صاحب سے حضرت الاستاذ نے فرمایا کہ حضرت مفتی حبیب الرحمان صاحب سے میری طرف سے گزارش کرنا کہ اسے (راقم کو) تمرین کے لیے اپنے پاس رکھیں اور ایسا ہی ہوا، اللہ اکبر! اتنی زیادہ فکر، کیسے نہ کہوں کہ وہ میرے لیے میرے والد سے بھی زیادہ مشفق ومہربان تھے!!

اکابر کے فتاوے بھی دیکھا کرو

شعبۂ افتا میں داخلے کے بعد جب تعلیمی سلسلہ باضابطہ شروع ہوگیا، تو ایک دن آپ نے فرمایا کہ اکابر کے فتاوے بھی دیکھا کرو، اس سے فتاوی نویسی کا طریقہ معلوم ہوگا، فتوے کی زبان کیسی ہوتی ہے؟ اس کا علم ہوگا، میں نے عرض کیا: حضرت آپ ہی نشاندہی فرمادیجیے! اس پر آپ نے فرمایا کہ حضرت گنگوہی رحمہ اللہ کے فتاویٰ دیکھا کرو اور اپنی تمرین کے استاذ: حضرت مفتی حبیب الرحمان صاحب خیر آبادی کے فتاویٰ بھی دیکھا کرو، چناں چہ میں نے آپ کے مشورے پر عمل شروع کردیا، میرے پاس ''باقیات فتاویٰ رشیدیہ'' کی جلد تھی، اسے پڑھتا، زبان قدیم تھی دشوار معلوم ہوئی؛ مگر آپ نے فرمایا کہ غور سے پڑھتے رہا کرو فائدہ ہوگا، حضرت الاستاذ مفتی حبیب الرحمان صاحب کے فتاویٰ کا

مجموعہ ''حبیب الفتاویٰ'' اس وقت شائع نہیں ہوا تھا، (اب بہ وقتِ تحریر اس فتاوے کی کئی جلدیں شائع ہوچکی ہیں) اس لیے تمرین کے گھنٹے میں وقت سے کچھ پہلے پہنچ جاتا اور آپ کے لکھے ہوئے فتاوی بہ غرضِ استفادہ آپ کی اجازت سے مطالعہ کرتا، حضرت الاستاذ کے فتاویٰ پڑھ کر، دو اہم باتیں سمجھ میں آئیں: ایک یہ کہ فتوے کی زبان نہایت آسان ہونی چاہیے، دوسری یہ ہے کہ عام حالات میں فتویٰ بے جا طویل نہیں ہونا چاہیے؛ بل کہ واضح طریقے پر نفسِ جواب کو پیشِ نظر رکھ کر مختصراً لکھنا چاہیے؛ البتہ اختصار اتنا نہیں ہونا چاہیے کہ مقصود میں مخل ہوجائے، باقی خاص حالت میں کبھی مستفتی جب کہ پڑھا لکھا ہو، کسی مسئلے کی تحقیق چاہتا ہو، یا سوال کی نوعیت ہی کچھ ایسی ہو، جو تفصیل چاہتی ہو، یا کوئی علمی مذاکرہ ہو؛ تو پھر ایسی صورت میں تفصیلی لکھنے میں بھی کوئی حرج نہیں؛ مگر خواہ مخواہ بے جا تفصیل کرنا اور ہر فتوے کو اس طرح لکھنا کہ عام مستفتی اصل جواب تک پہنچنے سے پہلے ہی تمہیدات کے جنگل میں پھنس کر آبلہ پائی کا شکار ہوجائے؛ یہ طریقہ کوئی بہت مفید نہیں، ہمارے تقریباً تمام اکابر کا فتاویٰ نویسی میں یہی طرز رہا کہ جواب آسان اور واضح ہو، غیر ضروری تفصیل سے خالی ہو، اکابر کے فتاوے کے مطالعے سے یہ بات بالکل واضح ہوجائے گی۔

وقف کی بحث سمجھ میں نہیں آرہی

افتا ہی کے سال جب تعلیمی سلسلہ درمیان سال میں پہنچا اور ''درمختار'' میں ''کتاب الوقف'' شروع ہوئی، تو بہت زیادہ کوشش کے باوجود بھی میری گرفت سے باہر ہورہی تھی، اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ میں نے اس سے پہلے وقف کی بحث کسی اور کتاب میں نہیں پڑھی تھی، دوسرے یہ کہ خود اس کے مسائل بھی کچھ ایسے دقیق ہیں کہ عام طور پر جلدی گرفت میں نہیں آتے اور سبق کی رفتار بھی بڑھنے لگ گئی تھی؛ کیوں کہ حضرت الاستاذ مفتی حبیب الرحمان صاحب خیرآبادی دامت برکاتہم کو اسی ایک گھنٹے میں ''شرح عقود رسم المفتی (مکمل)''، ''سراجی (مکمل)'' اور ''درمختار'' کی ''کتاب الوقف'' اور ''کتاب القضاء'' پڑھانی تھی، ظاہر ہے کہ کس قدر یہ کام مشکل تھا؛ مگر قربان جاؤں حضرت الاستاذ

پر کہ آپ نے اپنی پیرانہ سالی کے باوجود بالکل وقت پر نصاب مکمل کر دیا، اس میں خاص بات آپ کے درس کی پابندی تھی، راقم ہی حضرت کو سبق کے لیے لانے جاتا تھا بہ مشکل چند ایام ہی ایسے رہے ہوں گے، جن میں حضرت سبق کو نہیں آئے ہوں گے؛ ورنہ تو آپ کی پابندی اس عمر میں بھی قابلِ دید اور قابلِ رشک تھی؛ مگر افسوس کے ساتھ لکھنا پڑ رہا ہے کہ اب تعلیمی نظام میں اس قدر انحطاط آ گیا ہے کہ بعض جگہ کے متعلق تو یہاں تک سننے میں آتا ہے کہ استاذ نے پورے سال میں ''درمختار'' کے صرف بیس صفحے پڑھائے، اللہ اکبر! کس قدر حیرت اور تعجب کی بات ہے؟!!!

خیر! جب وقف کا بیان شروع ہوا اور کوشش کے باوجود بھی گرفت میں نہیں آ رہا تھا، تو میں نے حضرت الاستاذ سے بتایا کہ وقف کے ابواب کو سمجھنے میں پریشانی ہو رہی ہے، آپ نے فرمایا کہ ''نقایہ'' کی ''کتاب الوقف'' (نقایہ، شرحِ وقایہ کا جو متن ہے ''وقایہ''، اس کا مختصر ہے اور یہ اختصار بھی صاحب ''شرحِ وقایہ'' ہی نے کیا ہے، الحاصل صاحبِ شرحِ وقایہ نے اپنے دادا کے تیار کردہ متن: ''وقایہ'' کی شرح بھی کی اور اس کا اختصار بھی کیا) زبانی یاد کر لو، میں نے دارالعلوم کے کتب خانے سے فوراً اسے ایک کاپی پر لکھ کر چند دنوں میں یاد کر کے حضرت الاستاذ کو سنا دیا؛ مگر وہ بہت مختصر تھا، اس سے پریشانی کسی خاص حد تک حل نہ ہوئی، پھر میں نے دوبارہ عرض کیا کہ حضرت! پریشانی ابھی باقی ہے، اس پر آپ نے فرمایا کہ پھر ایسا کرو کہ ''درمختار'' تم پڑھ رہے ہو، اسی کے متن ''تنویر الابصار'' سے ''کتاب الوقف'' حفظ کر لو؛ چناں چہ فوراً میں نے اس کا حفظ شروع کر دیا، روزانہ ایک مقدار یاد کر کے آپ کو سناتا، جوں جوں آگے بڑھتا گیا، کتاب سمجھ میں آتی چلی گئی، حتیٰ کہ مکمل باب کا متن یاد کر لیا اور حضرت الاستاذ کو سنا دیا، کافی حد تک کتاب سمجھ میں آنے لگی، پھر حفظ مکمل ہونے کے بعد آپ نے فرمایا کہ اس کا ترجمہ مختصر تشریح کے ساتھ لکھ کر لایا کرو، میں نے یہ کام بھی ''شامی'' اور ''درمختار'' کا حاشیہ ''کشف الاستار'' جو تقریباً 'شامی'' ہی کا خلاصہ ہے، اسی طرح حضرت الاستاذ مفتی حبیب الرحمان صاحب کے سبق کی تقریر و تشریح جو ذہن میں ہوتی، سامنے رکھ کر شروع کر دیا، پابندی سے تھوڑا ہی سہی؛ مگر روزانہ لکھ کر لے جاتا، کچھوے کی چال چلتے چلتے میں نے منزل تک رسائی

میں کامیابی حاصل کرلی اور الحمد للہ ترجمہ وتشریح کا کام بھی مکمل ہوگیا اور کتاب پوری طرح سمجھ میں آ گئی، پھر میں نے سوچا کہ اس ترجمے وتشریح پر حضرت الاستاذ کی نگاہ پڑ چکی ہے؛ لہٰذا اسے کمپوز کرا کر محفوظ کرلینا چاہیے، میں نے کمپوز کرالی، پھر دل میں خیال آیا کہ نام بھی رکھنا چاہیے؛ لہٰذا میں نے خود ہی اس کا نام ''**عون الغفار في حل تنوير الأبصار**'' رکھ دیا اور آپ کو دکھایا، اس پر آپ خوش ہوئے اور ہمت بڑھائی پھر فرمایا کہ وقف کے مسائل کی ضرورت دنیاوی تعلیم یافتہ لوگوں کو بھی پیش آتی ہے؛ لہٰذا اسے اب چھاپ دو۔

قارئینِ کرام! ذرا اندازہ کیجیے کہ یہ وہ کتاب ہے کہ جس کی ابتدا یہ ہے کہ مجھے اس کا ایک لفظ سمجھ میں نہیں آرہا تھا اور چار ہی مہینے بعد انتہا یہ ہے کہ میں اس کا شارح بن چکا ہوں، کیا اس میں میرا کوئی کمال تھا؟ نہیں، بالکل نہیں؛ بل کہ یہ اس رجال ساز ہستی کا کمال تھا کہ جنھوں نے تدریجاً چند ہی مہینوں میں کہاں سے کہاں تک پہنچا دیا، کیا میرا دل اب بھی نہیں کہے گا کہ وہ میرے لیے میرے والد سے بھی زیادہ مہربان تھے!!

حضرت مفتی حبیب الرحمان صاحب کے پاس بھیجنا

''درمختار'' کی ''کتاب الوقف'' کے ترجمہ وتشریح کا کام جب مذکورہ طریقے پر مکمل ہوگیا اور میں نے اسے کمپیوز کرا کر اس کا نام بھی رکھ دیا، تو آپ نے خوشی کا اظہار فرمایا اور پھر مفتی اشتیاق احمد صاحب (استاذ دار العلوم دیو بند) سے فرمایا کہ اسے (راقم کو) مسودے کے ساتھ حضرت مفتی حبیب الرحمان صاحب خیر آبادی کے پاس لے جاؤ اور میری طرف سے درخواست کرو کہ چوں کہ اِس نے یہ کتاب حضرت ہی سے پڑھی ہے؛ لہٰذا حضرت ایک مرتبہ مسودے پر نگاہ ڈال دیں، اللہ جزائے خیر دے حضرت الاستاذ مفتی حبیب الرحمان صاحب کو کہ آپ دار الافتا وغیرہ کی بے پناہ مصروفیت، جس میں آپ کو سر اُٹھانے کا موقع نہیں ملتا، دوسرے پیرانہ سالی؛ ان سب کے باوجود جب ہم آپ کے پاس پہنچے، تو نہ صرف یہ کہ آپ نے درخواست قبول فرمائی؛ بل کہ اس ناکارے کے سلسلے میں حضرت مفتی اشتیاق احمد صاحب کے سامنے کچھ توصیفی کلمات بھی فرمائے اور چند ہی

دنوں میں مسودے پر نگاہ ڈال کر تقریظ بھی تحریر فرمادی۔**فجزاہ اللہ تعالیٰ عني خیر الجزاء.**

اس کے بعد پھر حضرت الاستاذ حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ نے بھی تقریظ ارقام فرما کر شفقت کی انتہا فرمادی، آپ کی تقریظ ملاحظہ ہو:

''فاضل گرامی جناب مولانا مرشد صاحب (استاذ مسیح العلوم، بنگلور) جب دار العلوم دیوبند میں دارالافتا میں طالبِ علم تھے اور حضرت مولانا مفتی حبیب الرحمان صاحب خیرآبادی مدظلہ سے ''درمختار'' کی ''کتاب الوقف'' پڑھ رہے تھے، تو ایک دن مجھ سے کہنے لگے: ''درمختار بہت بھاری معلوم ہورہی ہے!''، میں نے کہا: ''اس کا متن حفظ کرلو، شرح ہلکی ہوجائے گی''، اُنھوں نے فوراً ''تنویر الابصار'' کو ''الدر المختار'' سے کاپی میں الگ کیا اور تھوڑا تھوڑا یاد کر کے مجھ کو سنانے لگے، جب متن مکمل حفظ کرلیا، تو اس کی شرح: ''درمختار'' آسانی سے سمجھ میں آنے لگی، پھر اُنھوں نے ہمت کی اور شامی کا بھی مطالعہ شروع کردیا، پھر چھلانگ لگائی اور شرح بھی لکھنی شروع کردی، اس کو بھی روزانہ دکھاتے رہے، میں بس یوں ہی سرسری ان کی حوصلہ افزائی کے لیے دیکھ لیتا تھا، تا آں کہ شرح مکمل ہوگئی، پھر ان کو مصنف بننے کا شوق دامن گیر ہوا، یہ بہت اچھا شوق ہے، آج کل فضلا میں اس کا فقدان ہے، اُنھوں نے شرح کمپوز کرالی اور ''**عون الغفار في حل تنویر الأبصار**'' نام رکھا، پھر دیکھنے کا مجھے موقع نہیں ملا؛ کیوں کہ وہ مدرس ہوکر بنگلور جاچکے تھے اور دوبارہ دیکھنے کی ضرورت بھی نہیں رہی تھی، اب وہ طبع ہوکر منظرِ عام پر آرہی ہے، امید ہے اس سے دارالافتا کے طلبہ کو فائدہ پہنچے گا اور طلبہ کو یہ فارمولہ یاد رکھنا چاہیے، ذی استعداد طالب علم کو کوئی کتاب یا کوئی مسئلہ مشکل معلوم ہو، تو متن حفظ کرلے، پھر اس کا سمجھنا سہل ہوجائے گا، دعا کرتا ہوں اللہ تعالیٰ مصنف کی اس پہلی تصنیف کو قبول فرمائیں اور ان کو آگے قدم بڑھانے کی توفیق عطا فرمائیں، بڑھے چلو قدم

قدم منزل دور نہیں! واللہ الموفق۔‘‘

سعید احمد عفا اللہ عنہ پالن پوری
(خادم دار العلوم دیوبند)
۲۸/ ربیع الثانی ۱۴۳٦ھ

نوٹ!

اب یہ ترجمہ وتشریح ’’**عون الغفار في حل تنوير الأبصار** ‘‘ کے نام سے ’’مکتبہ حجاز دیوبند‘‘ سے چھپ چکا ہے، جسے اصحابِ افتا نے الحمد للہ قدر کی نگاہ سے دیکھا اور حضرت مفتی شبیر احمد صاحب دامت برکاتہم (مفتی مدرسہ قاسمیہ شاہی، مراد آباد) نے تو زبانی حوصلہ افزائی فرمانے کے علاوہ ’’فتاوی قاسمیہ‘‘ کا ایک نسخہ بھی اس نا اہل کو مسیح العلوم، بنگلور بھیج کر مزید حوصلہ بڑھایا۔**فجزاه الله تعالى عني خير الجزاء.**

آئندہ سال کیا کرنا ہے؟

طلبہ کا جب آخری سال ہوتا ہے اور اب اسے فراغت کے بعد عملی دنیا میں قدم رکھنا ہوتا ہے، تو یقیناً یہ ایک بہت ہی دشوار مرحلہ ہوتا ہے، درمیان ہی سال سے آخری سال کے طلبہ آپس میں ایک دوسرے سے پوچھنا شروع کر دیتے ہیں کہ آئندہ سال کیا کرنا ہے؟ اسی رِیت کے مطابق میرے ساتھیوں نے بھی مجھ سے یہ سوال پوچھا، اب تک میرے ذہن میں کچھ تفصیل نہیں تھی، بالاجمال اتنی بات بہت پہلے سے سوچ رکھی تھی کہ کچھ بھی ہو جائے اپنی لائن نہیں بدلنی ہے، چناں چہ ساتھیوں کے پوچھنے پر ہلکا سا خیال آیا کہ حضرت الاستاذ سے آئندہ سال کے متعلق کچھ پوچھنا چاہیے؛ مگر ہمت نہیں ہوئی اور کئی خیالات ایسے ذہن میں پیدا ہوئے، جو بالکل مانع بن گئے، جن میں سب سے بڑا یہ تھا کہ کیا میں حضرت کی جوتیوں میں اس لیے پڑا ہوں کہ کہیں اچھی تن خواہ والے ادارے میں مجھے بھیج دیں گے؟ نہیں، قطعاً نہیں! میں ہرگز آپ سے اس سلسلے میں کچھ نہیں کہوں گا، یہ پختہ ارادہ کر لیا، کچھ

دن گزرے کہ حسبِ معمول عصر کے بعد میں آپ کے سر پر تیل رکھ رہا تھا کہ کسی مناسبت سے آپ نے فرمایا کہ میرے افتا کے سال (حضرت الاستاذ کے افتا کے سال) ایک دن ایسا ہوا کہ میں اپنے استاذ حضرت علامہ بلیاوی رحمہ اللہ کے سر میں تیل رکھ رہا تھا، اسی دوران آپ نے پوچھا کہ سعید! آئندہ سال کیا ارادہ ہے؟ میں نے فوراً جواب دیا کہ حضرت! یہ باپ کے سوچنے کی چیز ہے یا بیٹے کی؟ اس پر علامہ رحمہ اللہ نے فرمایا کہ ٹھیک ہے، جیسے ہی حضرت نے یہ واقعہ سنایا (اس وقت میں بھی آپ کے سر پر تیل رکھ رہا تھا) فوراً میں نے دل میں کہا کہ بس مسئلہ حل ہے، بیٹے کی سوچنے کی چیز نہیں، باپ کے سوچنے کی چیز ہے، وہ سوچ رہے ہوں گے۔

معین مدرسی کی تیاری

بہ مشکل حضرت والا کے اس واقعے کو سنائے ایک مہینہ ہوا ہوگا کہ بالکل وہ خیال جو آیا تھا کہ ''بیٹے کے سوچنے کی چیز نہیں، باپ کے سوچنے کی چیز ہے''، سو فی صد ثابت ہوا، اس طور پر کہ اس سال دار العلوم میں معین مدرس رکھنے کی کچھ ہلکی پھلکی بات آئی تھی، اس پر حضرت نے فرمایا کہ ممکن ہے کہ معین مدرسی کا شعبہ جو چند سالوں سے بند ہے، دوبارہ کھلے؛ اس لیے تم اس کے امتحان کی بھی تیاری کرو اور چند کتابوں کی آپ نے نشان دہی بھی فرمائی کہ بالعموم ان کتابوں کا امتحان ہوتا ہے، جیسے: ''شرحِ تہذیب''، ''گلستاں''، ''قدوری'' وغیرہ؛ میں نے تیاری شروع کر دی: ''شرحِ تہذیب'' تو آپ نے ہی حل کرادی، اس طور پر کہ اس کا بھی پہلے متن (تہذیب) آپ نے زبانی یاد کرادیا، پھر عصر کے بعد جب میں آپ کے سر میں تیل رکھ رہا ہوتا، آپ پہلے متن زبانی سنتے، اس کے بعد زبانی ہی تشریح کے لیے فرماتے، میں اپنی تیاری کے مطابق تشریح کرتا، باقی جو کمی رہ جاتی، اُسے آپ پوری فرمادیتے، محسوس ہوتا تھا کہ نیچے جماعت کی فن کی بنیادی کتابیں آپ کو بالکل زبانی یاد ہیں، ''گلستاں'' میں خود حل کرتا جہاں سمجھ میں نہ آتی، وہ ہفتے میں ایک دن: جمعہ کے دن جمعہ کی نماز کے بعد معلوم کر لیتا اور نہ سمجھ میں آنے والے ایسے تمام مقامات پر پہلے ہی سے نشان لگا لیتا؛ کہ کہیں بھول سے رہ نہ جائیں۔

چودھری صاحب کو رخصت کرنا

پڑھنے لکھنے سے زیادہ آپ کے لیے کوئی محبوب مشغلہ نہیں تھا، ایسا لگتا تھا کہ جب آپ اس میں لگ جاتے ہیں، تبھی آپ کو چین آتا ہے، ابھی جیسا کہ اوپر عرض کیا کہ ''گلستاں'' میں مجھے جو بھی پوچھنا ہوتا، وہ ہفتے میں ایک دن جمعہ کے بعد، جب آپ کھانا تناول فرمارہے ہوتے، اسی دوران پوچھتا؛ کیوں کہ یہ سب کتابیں آپ کے نوکِ زباں تھیں، جیسے ہی عبارت پڑھتا، فوراً آپ ترجمہ وتشریح فرمادیتے، ایک دن ہوا یہ کہ جب ہم جمعہ کی نماز پڑھ کر حضرت کے ساتھ واپس ہورہے تھے؛ تو راستے میں دیکھا کہ ایک چودھری صاحب آپ کو مل گئے اور کچھ باتیں کرتے ہوئے گھر تک آ گئے، گھر کے اندر بھی آ گئے، اب میں نے سوچا کہ ہفتے میں ایک ہی دن مجھے اس کا موقع ملتا ہے، اب چودھری صاحب کی وجہ سے وہ بھی گیا؛ کیوں کہ خیال یہ ہوا کہ یہ ایک بڑے آدمی ہیں، میں بچہ ہوں، ظاہر ہے کہ حضرت اب مجھے واپس بھیج دیں گے، کسی اور دن معلوم کرنے کو کہیں گے؛ مگر قربان جاؤں آپ کی جوتیوں پر کہ فوراً جیسے ہی چودھری صاحب اپنی بات سے فارغ ہوئے، آپ نے اچھے لہجے میں فرمایا کہ اور بھی کچھ بات کرنی ہے؟ کیوں کہ اب میں اس کو پڑھانے میں مشغول ہوجاؤں گا، پھر آپ کو موقع نہیں ملے گا، چودھری صاحب نے کہا کہ جی بات ہوگئی، آپ نے فرمایا کہ ٹھیک ہے، اب میں مشغول ہوتا ہوں اور یہ کہہ کر چودھری صاحب کو رخصت فرمادیا، اتنے میں کھانا بھی آ گیا، آپ کھانا تناول فرماتے رہے اور مجھے اسی دوران پڑھاتے رہے؛ اندازہ کیجیے شفقت کا!!

''مسیح العلوم، بنگلور'' بھیجنے کے سلسلے میں مشورہ

سال کے اختتام پر جب مجلسِ شوریٰ نے معین مدرسی کے شعبے کے کھولنے کی اجازت نہیں دی، تو آپ نے حضرت مفتی محمد نعمان صاحب (مفتی دارالعلوم دیوبند) اور حضرت مفتی اشتیاق احمد صاحب (استاذ دارالعلوم دیوبند) سے مشورہ کیا کہ معین مدرسی کا شعبہ تو نہیں کھلا، لہٰذا اب اِسے (راقم کو) ''دارالعلوم، حیدرآباد'' بھیجنا چاہیے یا ''مسیح العلوم، بنگلور''؟ میرے دونوں کرم فرماؤں

نے مشورہ دیا کہ ''مسیح العلوم'' جانا بہت بہتر ہوگا (الحمدللہ آج اس بہتری کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں)۔اس پر آپ نے فرمایا کہ جی ہاں! میری نگاہ میں بھی ''مسیح العلوم ہی بہتر ہے!''؛ لہٰذا حضرت مفتی محمد نعمان صاحب کے ذریعے آپ نے حضرت مہتمم صاحب: حضرت مفتی محمد شعیب اللہ خان صاحب زید مجدہم کو پیغام بھیج دیا، جسے فوراً ہی قبول کرلیا گیا اور اس طرح میں الحمدللہ ''جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم، بنگلور'' آ گیا، چھ سال مکمل ہو گئے ہیں، اب یہی دعا ہے کہ حضرت نے جہاں بٹھا دیا ہے، بس جنازہ وہیں سے اُٹھے۔

''بخاری شریف'' کے افتتاح کے لیے آپ کی ''مسیح العلوم'' آمد

آج سے چھ سال پہلے، جس سال ''مسیح العلوم'' میں راقم کا تقرر ہوا، اسی سال چوں کہ ''مسیح العلوم'' میں دورۂ حدیث شریف کا مبارک سلسلہ جاری ہو رہا تھا؛ اس لیے حضرت الاستاذ ''بخاری شریف'' کے افتتاح کے لیے مدعو تھے، مسلسل کئی سال آپ کے پاس رہ کر جو رات دن آپ کی محبتیں، شفقتیں دیکھنے کو مل رہی تھیں، اس کا سلسلہ دار العلوم سے نکلنے کے بعد ختم ہو گیا، تو دل بہت پریشان رہتا تھا اور آپ کی محبتیں و شفقتیں بہت یاد آتی تھیں؛ تو جب آپ ''مسیح العلوم'' پہنچے، تو گاڑی سے اترتے ہی غیر اختیاری طور پر آپ سے چمٹ کر ہچکیاں لے لے کر رونے لگا، اس پر آپ نے جب تک میں روتا رہا، مجھے دور نہیں ہٹایا؛ بل کہ مسلسل آپ میرے سر پر ایک شفیق باپ کی طرح ہاتھ پھیرتے رہے؛ یہاں تک کہ میرا رونا کم ہو گیا۔

متعلقہ کتابوں میں جزوی تبدیلی

''مسیح العلوم'' میں پہلے سال جو کتابیں مجھ سے متعلق ہوئیں، ان کی اطلاع دینے کے لیے آپ کو فون کیا، اس وقت آپ ٹرین میں تھے؛ مگر بات ہو گئی میں نے اطلاع کر دی کہ فلاں فلاں کتابیں مجھ سے متعلق کی گئی ہیں، ان میں ایک کتاب ''النشر الجدید'' (جو مختلف عربی اخبار کے تراشہ جات کا مجموعہ ہے) بھی تھی، جو دار العلوم میں تکمیلِ ادب میں وقت کے لاثانی ادیب: حضرت الاستاذ

مولانا نور عالم خلیل صاحب امینی دامت برکاتہم پڑھاتے ہیں، اتفاق سے یہاں ششم کی جماعت (جو ''مسیح العلوم'' میں ہفتم کے نام سے جانی جاتی ہے) میں داخل ہے، خیر! حضرت نے نصیحت فرمائی کہ جو بھی کتاب ہے، اُسے محنت سے پڑھاؤ، میں نے جی کہہ کر فون رکھ دیا؛ مگر قربان جاؤں کہ آپ شاید پھر ایک ایک کتاب کے متعلق غور کرنے لگے اور پھر اُسی وقت آپ نے حضرت مفتی محمد نعمان صاحب کو فون کیا کہ ''النشر الجدید'' مرشد کے لیے اَبھی مناسب نہیں؛ لہٰذا مفتی شعیب اللہ صاحب سے میری طرف سے کہو کہ اسے بدل دیں، جب حضرت مہتمم صاحب نے مجھے بلا کر کتابوں سے متعلق کچھ پوچھا، اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ آپ کا فون آیا تھا، جس پر کچھ جزوی تبدیلی ہوئی ہے۔

قارئینِ کرام! آپ اِن واقعات کو ملاحظہ فرمانے کے بعد فیصلہ کیجیے کہ یہ ساری فکریں ایک مشفق ومہربان باپ کی طرح نہیں ہورہی؟! اَبھی اور بھی ملاحظہ فرمایئے!

''مقاماتِ حریری'' زبانی یاد کرنے کی ہدایت

جیسا کہ ابھی اوپر ذکر کیا گیا کہ جس سال میں ''مسیح العلوم'' آیا، اسی سال حضرت الاستاذ بھی افتتاحِ ''بخاری شریف'' کے لیے ''مسیح العلوم'' تشریف لائے، رات کا قیام جناب این. فاروق احمد صاحب مرحوم کے یہاں اُن کے گھر پر ''فریزر ٹاؤن'' میں رہا، میں اور مفتی محمد نعمان صاحب بھی آپ کے ساتھ رات میں وہیں تھے، رات کی تنہائی میں جب میں آپ کے سر کو سہلا رہا تھا، تو آپ نے فرمایا کہ ''مقاماتِ حریری'' کی عبارت زبانی یاد کرلو اور پڑھاتے ہوئے صیغوں کو اس طرح حل کرو کہ اگر کہیں ''مجرد'' سے استعمال ہوا ہے؛ تو اس جگہ اس کا ''مجرد'' ہی طلبہ کو بتاؤ، اس کا ''مزید'' مت بتاؤ، اسی طرح اگر کہیں ''مزید'' استعمال ہوا ہے؛ تو وہاں صرف اس کا ''مزید'' ہی بتاؤ، اس کے ساتھ ''مجرد'' مت بتاؤ؛ ورنہ طلبہ کا ذہن الجھے گا، کتاب مشکل ہے، وہ سب کے چکر میں کچھ بھی یاد نہیں رکھیں گے؛ البتہ افعال کے ''صلات'' ضرور بتاتے رہنا؛ اس لیے کہ صلات کے بدلنے سے معانی

بدل جاتے ہیں، شروع کے سالوں میں پڑھانے کا طریقہ تو یہی رکھا اور اَب تک بھی یہی ہے؛ مگر کتاب یاد نہیں کر سکا، ہاں الحمد للہ! اب اِدھر تین سالوں سے کتاب اس طرح یاد کر لی کہ علامہ حریری کی عبارت کے ساتھ بین السطور اور ضرورت کی حد تک حاشیہ بھی سبق میں طلبہ کو زبانی پڑھ کر سنا دیتا ہوں اور ''مقامات'' پڑھاتے ہوئے اس سال (۱۴۴۱ھ) سے پہلے کے دو سال، تو پورے سال کبھی بھی کتاب سامنے نہیں رکھی؛ یہ حضرت ہی کے توجہ دلانے سے ہوا؛ ورنہ اس ناکارے کو کیا پتہ، جس نے ایسے والدین کے گھر میں جنم لیا، جن بے چاروں کو اپنا نام تک لکھنا نہیں آتا تھا۔

حیران کن تھی آپ کی دور اندیشی

جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا کہ راقم نے آپ کے مشورے سے ''مقاماتِ حریری'' کے مکمل دس مقامے، جو نصاب میں داخل تھے، اسے پوری طرح زبانی حفظ کر لیا تھا (والحمد للہ علی ذلک)، جس کی بنا پر آگے چل کر کتاب کافی آسان ہو چکی تھی؛ اس لیے یہ آسانی کچھ وقت باقی رہتے ہوئے ہی نصاب تک پہنچ جاتا تھا؛ چناں چہ خیال ہوا کہ مزید کچھ مقامے طلبہ کو پڑھا دینے چاہئیں، اس سلسلے میں مشورے کے لیے آپ کو فون کیا اور اپنے ارادے کا اظہار کیا، آپ نے اس موقع پر ایسا حیران کن، دور اندیشی کا جواب دیا کہ عقل بالکل دنگ رہ گئی اور آپ کی فہم وفراست پر بے پناہ رشک آیا آپ نے فرمایا کہ ''اسی دس مقامے میں مزید مشق وغیرہ کروادو؛ مگر نصاب سے آگے نہ پڑھاؤ، ہو سکتا ہے کہ آئندہ یہ کتاب کسی دوسرے مدرس کو ملے اور اُنھیں نصاب کی پریشانی ہو۔''

یہ تو بات تھی نصاب سے کچھ زیادہ پڑھانے کے متعلق؛ مگر اس وقت نصاب کی تکمیل میں کوتاہی ولاپرواہی جس درجے میں سننے کو مل رہی ہے، وہ رہ رہ کے دل میں ایسی ٹیس مارتی ہے کہ دل بالکل پریشان ہو کر رہ جاتا ہے، بار بار یہ خیال آتا ہے کہ کیا ہم اپنی حقیقی اولاد کے ساتھ ایسا کریں گے؟ یا ایسا کیے جانے کو پسند کریں گے؟ جواب اگر نفی میں ہے اور یقیناً ہے، تو پھر میرے بھائیو! ہم یہ کیوں نہیں سوچتے کہ طلبہ بھی تو ہماری اولاد ہی ہیں، آخر ہم ان کے ساتھ ایسا کیوں کر رہے ہیں؟ کیا یہ ان

کی زندگی سے کھیلنا نہیں ہے؟اگر مدرسے کے ذمے دار ہماری اس حرکت سے واقف نہیں ہیں،تو کیا اللہ تعالیٰ بھی نہیں دیکھ رہے ہیں؟ کچھ تو خوف کیا جائے۔

انتہا تو یہ ہے کے طلبہ جب پریشان نظر آتے ہیں،تو ان سے کہا جاتا ہے کہ بس اساتذہ کی قدر کرو،اسی سے علم آئے گا؛نصاب وِصاب کوئی چیز نہیں،توبہ!توبہ!

میرے بھائیو! ہم اللہ پاک کے سامنے کی جواب دہی کو سامنے رکھیں،طلبہ کو اپنی اولاد سمجھیں، نصاب مکمل کرنے کی پوری کوشش کریں۔

حضرت الاستاذ رحمہ اللہ کا جس سال بائی پاس ہوا،اس سال کچھ دنوں تک حضرت مہتمم صاحب دامت برکاتہم (مفتی ابوالقاسم صاحب نعمانی،مہتمم دارالعلوم دیوبند) نے نصاب ہی کی وجہ سے حضرت کی اجازت سے ''بخاری شریف'' کا درس دیا،پھر اتفاق سے حضرت مہتمم صاحب کی طبیعت بہت زیادہ ناساز ہوگئی،تو باوجودے کہ ابھی حضرت الاستاذ کی طبیعت بہت بہتر نہیں ہوئی تھی؛ پھر بھی آپ نے سبق شروع فرمادیا کہ طلبہ کا نقصان ہورہا ہے!!اللہ اکبر! کیا آپ نہیں کہہ سکتے تھے کہ علم تو بس اساتذہ کی قدر سے آتا ہے نصاب کیا چیز ہے؟!

اسی سال ۱۴۴۱ھ میں راقم نے اپنی آنکھ سے اپنے مہتمم صاحب (حضرت اقدس مفتی محمد شعیب اللہ خان صاحب زید مجدہ) کو دیکھا کہ آپ جب لمبے سفر سے واپس تشریف لائے،تو نصاب کی تکمیل کی فکر میں مسلسل رات دن ''بخاری شریف'' کا درس دے رہے تھے، جب کہ اسی دوران آپ کو گردن کا درد اور چکر اس قدر شدید رہتا تھا کہ ساتھ رہنے والے طلبہ کو ہاتھ تھامے رہنا پڑتا تھا کہ کہیں گر نہ جائیں،آخر کس چیز نے آپ کو اتنا بے چین کیا تھا؟! کیا آپ کو یہ فلسفہ معلوم نہیں تھا کہ نصاب کوئی چیز نہیں؟!

نہیں، بھائیو! حقیقت یہ ہے کہ یہ تھی آپ کی طلبہ سے محبت اور ان کی تعلیم کی فکر، ہمارے بڑوں کے عمل میں ہمارے لیے بہت کچھ سیکھنے کی چیزیں ہیں،اگر ہمارا دیدہ ودل وا ہو ورنہ ''چوری اور سینہ زوری'' دونوں ہوگی؛اللہ پاک ہمیں طلبہ کے حقوق کی ادائیگی کی توفیق ارزانی کرے اور اِنھیں اپنی

اولاد سمجھنے کی توفیق دے، آمین۔

تدریس میں پیش آنے والی پریشانی اور اس کا حل

علامہ ابن ہشام انصاری رحمہ اللہ کی نحو میں مشہور ترین تین کتابیں ہیں: (۱) **مغني اللبيب**، (۲) **شرح شذور الذهب**، (۳) **شرح قطر الندی**؛ اول الذکر تو تفصیلی ہے، تین چار جلدوں میں ہے، دوسری اور تیسری بعض بعض جگہوں پر داخل نصاب ہے، ''جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم'' میں ''**شرح قطر الندیٰ**'' شاملِ نصاب ہے، یہ کتاب مجھ سے متعلق تھی، یہ کتاب آسان بھی ہے اور مشکل بھی؛ کیوں کہ ابن ہشام رحمہ اللہ خود نحو کے امام ہیں، وہ ہر ہر بات میں دوسرے ائمہ نحو کی تقلید نہیں کرتے؛ لہٰذا بعض مقامات پر پریشانی ہوتی تھی، آپ کو فون کر کے بتایا، آپ نے فرمایا کہ صرف اس کتاب پر اعتماد نہ کرو، اس سے نیچے کی نحو کی تمام کتابیں اور اس کے علاوہ اوپر کی بھی کچھ کتابیں دیکھو، جب اس طرح میں نے مطالعہ شروع کیا، تو آہستہ آہستہ ''**شرح قطر الندیٰ**'' قابو میں آنے لگی، حضرت کو فون کر کے بتایا، تو آپ نے خوشی کا اظہار فرمایا اور اسی سال ایک موقع سے دارالعلوم کی ''مسجدِ رشید'' میں طلبہ کو اس حوالے سے نصیحت کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر کوئی کتاب سمجھ میں نہ آئے، تو اسی طرح اسے دیکھو اور پھر ان طلبہ کے سامنے میرا تذکرہ فرما کر فرمایا کہ ''میرا ایک شاگرد بنگلور مسیح العلوم میں ہے، اسے کتاب پوری طرح نہ سمجھ میں آنے کی پریشانی تھی؛ مگر جب میرے اس مشورے پر عمل کیا، تو الحمد للہ اسے کتاب سمجھ میں آنے لگی''۔

''ہدایہ (رابع)'' کا ایک لفظ: ''رطبة''

جب سے بندہ ''مسیح العلوم'' میں مدرس ہو کر آیا ہے، اس وقت سے حضرت الاستاذ کی وفات تک متعدد مرتبہ کسی عبارت کے، کسی لفظ کے سمجھ میں نہ آنے پر فون کیا اور آپ نے فوراً کتاب منگوا کر وہ عبارت فون پر ہی مجھے سمجھا دی، اس سلسلے کے بھی کئی واقعات ہیں؛ مگر اس وقت صرف ایک واقعے کا تذکرہ کر رہا ہوں، جو اِسی سال (۱۴۴۱ھ) کے رجب میں ''ہدایہ (رابع)'' کے ایک سبق کے

دوران پیش آیا، واقعہ یہ ہے کہ ''ہدایہ (رابع)'' کی ''کتاب المساقاۃ'' میں ایک لفظ آیا: ''رطبة''، اس کا معنی خوب واضح طور پر سمجھ میں نہیں آرہا تھا، کئی کتابیں، لغت وغیرہ بھی دیکھا؛ مگر خوب واضح نہیں ہو پا رہا تھا، جب ''عین الهدایہ'' (یہ ضرورت کے وقت حضرت ہی کے مشورے سے ''ہدایہ'' پڑھانے کے دوران میں دیکھتا ہوں، آپ نے فرمایا تھا کہ ''ہدایہ'' پڑھاتے ہوئے اچھی طرح صرف ''بنایہ'' دیکھنا اور ضرورت پر ''عین الهدایہ'' دیکھنا) دیکھا، تو وہاں اس کا ترجمہ کیا ہوا تھا: ''سست، گندنا'' یہ بھی مجھے سمجھ میں نہیں آیا، چناں چہ اپنا آخری ملجأ یاد آیا اور میں نے آپ کو مغرب بعد فون کیا اور بتایا کہ ''ہدایہ رابع، کتاب المساقاۃ'' میں ایک لفظ ''رطبة'' آیا ہے، مجھے اس کا معنی اچھی طرح سمجھ میں نہیں آرہا ہے، آپ نے فرمایا کہ ابھی ہدایہ میرے پاس تو نہیں ہے؛ جلد، صفحہ، باب بتادو اور وہ لفظ بتادو میں دیکھ کر رکھتا ہوں، اسی دوران میں نے بتایا کہ حضرت ''عین الهدایہ'' والے نے اس کا ترجمہ ''گندنا'' سے کیا ہے، اتنا میرا کہنا تھا کہ فوراً آپ بول پڑے، اُوہو! وہ تو پیاز کی طرح کا ایک پودا ہوتا ہے، اس کی جڑیں کھائی جاتی ہیں اور اس کی پیداوار مکے میں ہوتی ہے؛ لہٰذا جب تم اسے جانتے ہی نہیں، دیکھے ہی نہیں، تو پوری طرح کیسے سمجھو گے، بس بچوں کو یہ بتادو کہ پیاز کی طرح کا ایک پودا ہوتا ہے، اس کی جڑیں کھائی جاتی ہیں؛ چناں چہ میں نے طلبہ کو بالکل اسی طرح حضرت کے نام کے ساتھ بتایا، جس سے وہ بھی بہت خوش ہوئے۔

میرے احوال سننے کا وقت

میں جب مدرس ہو کر ''مسیح العلوم'' آگیا، تو آپ جب کبھی بھی ''مسیح العلوم، بنگلور'' تشریف لائے یا بنگلور کے قریب کہیں آپ کا آنا ہوا اور میں وہاں پہنچ گیا، تو رات میں بالکل جب آپ پوری طرح سونے کی تیاری فرما لیتے، الگ کمرے میں ہو جاتے ملنے جلنے والوں کو رخصت کر دیتے، بالکل تنہائی ہو جاتی، تو آپ مجھے بلاتے اور فرماتے کہ ''میرا سر ذرا سہلاؤ، دبانا نہیں'' جیسے ہی میں شروع کرتا، فوراً پوچھنا شروع فرما دیتے کہ کیا حال ہے؟ خیریت سے ہو؟ میری حتیٰ الامکان ہمیشہ کوشش یہ

ہوتی ہے کہ چھوٹی موٹی تکلیف آپ کے سامنے بیان نہ کروں؛ تاکہ آپ کو تکلیف نہ ہو، بالعموم میں جواب یہی دیتا کہ خیریت سے ہوں، الحمد للہ کوئی پریشانی نہیں ہے، پھر گھر کے متعلق معلوم کرتے، اس کا بھی بالعموم جواب یہی ہوتا، ایک آدھ بار اپنی کسی پریشانی کا ذکر کیا، اسے بھی یا تو ازخود حل فرمایا، یا اس کے لیے مناسب کوشش فرمائی۔

تمھاری حرفِ ''عین'' کی ادائیگی درست نہیں

جس سال حضرت کے دل کا آپریشن ہوا تھا، اس سال کچھ دنوں تک بعض نمازیں آپ گھر میں ہی ادا فرماتے تھے، جس کی امامت بالعموم میں ہی کیا کرتا تھا، ایک دن آپ نے فرمایا کہ حرفِ ''عین'' کی ادائیگی تم ٹھیک نہیں کرتے؛ لہٰذا قاری شفیق الرحمان صاحب بلندشہری کے پاس جاؤ (آپ دار العلوم میں تجوید وقرأت کے ماہر اور قدیم استاذ ہیں) اور میرا نام لے کر کہو کہ میں نے تمھیں حرفِ ''عین'' کی ادائیگی کی درستگی کے لیے بھیجا ہے، یہ میرے شعبۂ افتا کا سال تھا، مغرب کے بعد مطالعۂ شامی کا گھنٹہ تھا؛ لیکن میں پابندی سے ایک مہینے تک (جب تک قاری صاحب نے یہ نہیں کہہ دیا کہ اب آنے کی ضرورت نہیں) مغرب کی نماز کے بعد حضرت والا کے یہاں سے فوراً واپس آکر مطالعۂ شامی کے گھنٹے کے متعلقہ استاذ کے درسگاہ پہنچنے سے پہلے پہلے تھوڑی دیر کے لیے روزانہ حاضر ہوتا اور حضرت قاری صاحب نے، حضرت والا کی نسبت سے بڑی محبت سے نہ صرف یہ کہ ''عین'' کے مخرج کو درست کروایا؛ بل کہ مزید اچھی طرح اور مشق بھی کروادی۔ **فجزاہ اللہ تعالیٰ عني خیر الجزاء۔**

والد مرحوم کی وفات پر آپ کا ایک اہم مشورہ

شعبۂ افتا ہی کے سال والد گرامی کا سایہ سر سے اٹھ گیا، گھر سے جوں ہی اس حادثے سے متعلق فون آیا، فوراً حضرت الاستاذ کے پاس پہنچا، آپ نے مشورہ دیا کہ گھر چلے جاؤ، دیگر بھائی جو ممبئی میں تھے، میں نے ان کو فون کیا کہ آپ حضرات آئیں، باقی میں پہنچ کر تا خیر کیے بغیر کفنانے، دفنانے کی

کوشش کروں گا، اس پر بھائیوں نے جواب دیا کہ پھر ہمارے آنے کا کیا فائدہ؟ جب والد صاحب کے جنازے میں شریک ہی نہ ہوسکیں گے؟ ان کی یہ بات سن کر تو میں بالکل ہی پریشان ہوگیا، اگر ان کا انتظار کروں؛ تو شریعت کا جو تجہیز و تکفین کے سلسلے میں تعجیل کا حکم ہے؛ اس پر پوری طرح عمل نہ کرسکوں اور اگر شریعتِ مطہرہ کی تعلیم کے مطابق عمل کروں، تو بہ ظاہر آپسی شدید اختلاف کا اندیشہ؛ کیوں کہ بھائیوں میں سے کوئی ایک بھی دین کی تعلیم سے واقف نہیں، عجیب طرح کی پریشانی میں مبتلا ہوگیا، اِدھر والد صاحب کا جنازہ رکھا ہوا، اُدھر بھائیوں میں آپسی ناراضگی کا اندیشہ، خیر فوراً حضرت الاستاذ کو فون کیا اور صورتِ حال سے آگاہ کیا اور بتایا کہ بھائیوں میں کوئی ایک بھی پڑھے لکھے نہیں ہیں اور صورتِ حال ایسی ہوچکی ہے، چناں چہ حضرت نے فرمایا کہ بڑا فتنہ ہوجائے گا؛ لہٰذا میری رائے یہ ہے کہ ایسی صورت میں تھوڑا ان کا انتظار ہی کرلو؛ کیوں کہ یہ ہمیشہ کے لیے آپسی اختلاف کی ایک چیز بن جائے گی، بروقت حضرت اقدس کے اس حکیمانہ مشورے سے ہم سب بھائی ایک شدید آپسی اختلاف سے بچ گئے اور بڑے بھائی کے علاوہ (جو اپنے ہی کسی عذر سے وقت پر نہ پہنچ سکے)؛ سبھی جنازے اور تدفین میں شریک ہوگئے۔

میں تمھارا والد ہوں!!

شعبۂ افتا کے سال جب میرے والد (مرحوم) اللہ کو پیارے ہوگئے، تو اس موقع پر جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا راقم حضرت الاستاذ سے مشورہ کر کے تجہیز و تدفین میں شرکت کے لیے اپنے آبائی وطن: ''مظفر پور، بہار'' چلا گیا، چند دن بعد جب واپس دار العلوم آیا، تو سب سے پہلے حضرت الاستاذ کے گھر پہنچا، عشا کی نماز کا وقت تھا؛ اس لیے محلے کی مسجد ہی کی طرف چل دیا، مسجد کے دروازے پر پہنچتے ہی دیکھا کہ نماز ہوچکی ہے اور آپ صحن مسجد میں تشریف لا رہے ہیں، ابھی میں مسجد کے باہر ہی تھا؛ کہ جوں ہی آپ کی نظر مجھ پر پڑی؛ آپ نے اپنے دونوں بازو پھیلا دئے اور فرمایا کہ آجاؤ بھائی! آجاؤ! اور جیسے ہی میں قریب پہنچا، نہایت ہی محبت کے ساتھ اپنے کلیجے سے لگالیا، زبان سے تو کچھ

نہیں کہا؛ مگر جس انداز سے اپنے کلیجے سے لگائے رہے، اس سے صاف دل کہہ رہا تھا کہ آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ غم نہ کرو: ''آج سے میں تمھارا والد ہوں''!!

میرا حفظ قرآنِ کریم کم زور نہ ہو جائے

میرے شعبۂ افتا کے سال حضرت الاستاذ نے فرمایا کہ دارالعلوم میں پچھلے چند سالوں سے معین مدرسی کا شعبہ بندہ، امید ہے آئندہ سال یہ شعبہ پھر سے کھلے؛ لہٰذا تم اس میں امتحان کی تیاری کرو؛ تاکہ کامیابی کی صورت میں معین مدرس کے طور پر دارالعلوم میں تمھارا انتخاب ہو سکے اور آپ نے تیاری کے سلسلے کی راہ نمائی بھی فرمادی، میں نے تیاری شروع کردی، اسی دوران خیال آیا کہ رمضان المبارک کے بعد شوال میں اس کا انٹرویو ہوگا؛ لہٰذا رمضان المبارک میں دیوبند ہی میں رک کر مزید اچھی تیاری کرلوں گا اور تراویح سنانے کا کوئی جزوی نظام بنالوں گا؛ لیکن ظاہر ہے جو کرنا تھا، وہ حضرت کے مشورے سے ہی کرنا تھا، اس کے بغیر تو ممکن ہی نہ تھا؛ لہٰذا ایک دن موقع نکال کر تنہائی میں ہوتے ہوئے، میں نے آپ کے سامنے اپنے ارادے کا اظہار کیا، جیسے ہی میں نے اپنی بات ختم کی، فوراً ذرا سا تلخ لہجے میں فرمایا کہ ''جہاں بھی رہو، جو بھی کرو؛ مگر قرآن سنانا ہے، قرآنِ کریم کچا نہیں ہونا چاہیے، تراویح میں قرآن سنانا چھوٹنے کی وجہ سے میرا اور حسین بھائی (یہ آپ کے ایک لائق وفائق صاحب زادے: مفتی حسین صاحب مرتبِ تحفۃ الالمعی وتحفۃ القاری ہیں) کا قرآن کچا ہو گیا ہے''۔

کیا اس طرح کی فکر ایک شفیق باپ کے علاوہ بھی کوئی کسی کے لیے کرسکتا ہے، اس واقعے کو تقریباً سات سال ہو چکے ہیں؛ مگر جب بھی تراویح میں قرآن ختم کرتا ہوں، آپ کا یہ پیار بھرا خیر خواہانہ جملہ میرے کانوں میں اس طرح گونجتا ہے، جیسے کہ گویا ابھی آپ یہ فرمار ہے ہیں۔

یہ پدرانہ شفقت نہیں تو اور کیا؟

یہ دیکھئے ایک اور شفقتِ پدرانہ، ۳۵-۱۴۳۴ھ میں جب میں شعبۂ افتا کا طالب علم تھا، اسی سال میں یہ سوچ کر کہ یہ آخری سال ہے، زیادہ سے زیادہ حضرت الاستاذ کے قریب رہ کر فائدہ اٹھانا

چاہیے، بقر عید کی چھٹی میں گھر نہیں گیا اور حضرت الاستاذ کو بتایا کہ میں نے ایسا سوچا ہے، آپ نے فرمایا کہ ٹھیک ہے۔ عید الاضحیٰ کے دن میں عید الاضحیٰ کی نماز پڑھ کر استاذ محترم حضرت اقدس مفتی عبد اللہ صاحب معروفی دامت برکاتہم کے گھر جا کر سو گیا، (آپ مع اہلِ خانہ اپنے وطن گئے تھے اور دیکھ ریکھ کے لیے گھر کی چابی مجھے دے کر فرمایا تھا کہ تم یہیں سو جایا کرو) اور یہ سوچا کہ آج خوشی کا دن ہے، حضرت الاستاذ اپنے گھر کے افراد میں، قربانیاں کرنے میں مشغول ہوں گے؛ لہٰذا ایسے موقع پر مجھے بیچ میں جا کر مخل نہیں ہونا چاہیے؛ مگر ایک دوسرے ساتھی مولانا مفتی محمد فائز صاحب (استاذ دار العلوم، آمبور) عید الاضحیٰ کی نماز کے بعد آپ کے گھر چلے گئے، (ان سے بھی آپ بہت محبت فرماتے تھے، ہم دونوں بالعموم ساتھ ہی آپ کی خدمت میں رہتے تھے) آپ نے ان سے میرے بارے میں غالباً کچھ پوچھا ہوگا، مثلاً: یہی کہ مرشد کہاں ہے؟ معقول جواب نہ ملنے پر، آپ نے اپنے پوتے: سمیع اللہ سلمہ کو برادرِ محترم مولانا محمد فائز صاحب کے ساتھ بھیجا کہ دیکھو مرشد کہاں ہے؟ اگر مل جائے، تو بلا لو، کھانا کھالے گا اور ساتھ ہی ان ہی کے ہاتھوں ڈھائی ہزار روپے عیدی بھی آپ نے بھیجا کہ یہ بھی اسے دے دینا، اتفاق سے اس وقت مجھ سے عزیزم: سمیع اللہ سلمہ کی ملاقات نہ ہو سکی، شام کو عصر سے پہلے برادرِ مکرم مولانا محمد فائز صاحب نے حضرت کی طرف سے عیدی دیتے ہوئے جب یہ پورا واقعہ سنایا؛ تو کئی دنوں تک جب بھی ان شفقتوں کا خیال آتا تھا (اور اب بھی) آنکھیں آنسو بہائے بغیر نہیں رہ پاتی تھیں، اگر میں یہ کہوں کہ اس وقت میری عمر کے لحاظ سے اگر میری زندگی کی تمام عیدوں کی عیدی جمع کی جائے، تو شاید اس مقدار کو نہ پہنچ پائے، جو ایک عید میں آپ نے عطا فرمائی، تو ادنیٰ سا بھی مبالغہ نہ ہوگا؛ کیوں کہ اس راقم نے ایک ایسے والد کے گھر میں آنکھ کھولی، جن بے چارے کو اگر روز پیٹ بھرنا تھا، تو لازماً روز مزدوری کرنی تھی، ظاہر ہے ایسے گھر میں عیدی کا کس درجے تصور کیا جا سکتا ہے، وہ بالکل واضح ہے، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ میرے حقیقی والد کو بھی اللہ پاک بہترین بدلے سے خوب نوازے، اُنھوں نے بڑی تکلیف اٹھا کر ہم تمام بھائی بہنوں کی پرورش فرمائی۔

اس سے کہو کہ پیسا نکال لے

چند سال پہلے بنگلور میں ایک کمپنی کا وجود عمل میں آیا، راقم نے تھوڑی سی رقم اس میں لگا دی، ابھی کمپنی کے شباب کا آغاز تھا، وقت پر اور اچھی مقدار میں نفع موصول ہو جاتا تھا؛ مگر جب آپ کو کسی طرح اس کا علم ہوا، تو فوراً حضرت مفتی محمد نعمان صاحب سے فرمایا کہ کمپنی والوں کا بھروسہ نہیں ہوتا؛ لہٰذا اس سے کہو کہ اپنا پیسا نکال لے، حکم آتے ہی مجال کیا تھی کہ تاخیر کر دیتا، فوراً درخواست ڈال دی اور پندرہ دن میں میری رقم واپس آ گئی، چند ہی سال بعد کمپنی نازک حالات کا شکار ہو گئی۔

ایک معاملے میں مشورے میں تاخیر اور اس کا نقصان

ویسے تو زندگی کے تقریباً تمام ہی مراحل میں خواہ اس کا تعلق تدریس سے ہو یا اصلاحِ نفس سے یا گھریلو زندگی سے، آپ سے مشورے کے بعد ہی قدم اٹھاتا؛ مگر اپنی نادانی سے کبھی اس کے خلاف بھی کیا؛ چناں چہ ایک مرتبہ ایسا ہی ہوا کہ ایک اہم معاملے کو آسان سمجھتے ہوئے وقت سے پہلے میں نے آپ سے مشورہ نہیں کیا اور اب اس کا خمیازہ بھگتنا پڑ رہا ہے، یہ واقعہ بھی صرف اس لیے لکھ رہا ہوں کہ اپنے بڑوں سے مشورے کے بغیر کبھی کوئی قدم نہ اٹھایا جائے، خواہ معاملہ بہ ظاہر کتنا ہی آسان ہو، ہوا یہ کہ والد صاحب کی وفات کے بعد، ہم پانچ بھائی اور دو بہنوں کے درمیان بہت سی چیزیں مشترک تھیں، ہم نے سوچا کہ شرعی طریقے پر ہر ایک کو تقسیم کر کے ان کا حق دے دیا جائے، چناں چہ سب جمع ہوئے، معاملہ حل ہوا، میں نے بھائیوں سے کہا کہ چوں کہ میں گاؤں میں رہتا نہیں؛ لہٰذا میرے حصے کی زمین آپ حضرات ہی رکھ لیں اور اس کی جو رقم بنتی ہے، وہ مجھے دے دیں، ان حضرات نے کہا کہ مرضی تمھاری، چاہو تو زمین لے لو، چاہو تو پیسے لے لو، میں نے رقم لے لی، بنگلور آ کر میں نے حضرت کو فون کیا اور صورتِ حال بتائی، اس پر آپ نے فرمایا کہ تم نے غلط کیا، جس طرح دیگر بھائیوں نے زمین لی، اسی طرح تمھیں بھی زمین لینی چاہیے تھی اور اسے چھوڑ دیتے آگے کام آتی؛ کیوں کہ جتنی رقم تمھیں ملی ہے، مہنگائی کے اس دور میں اس سے کچھ نہیں ہونے کا، میں نے

عرض کیا کہ حضرت سوچا تھا کہ بہ طور مضاربت کسی کو دے دوں گا کچھ نفع آ جایا کرے گا، اس پر آپ نے فرمایا کہ اس دور میں کوئی کسی کو کما کر نہیں دیتا۔ اللہ اکبر! کس طرح آپ کی بات سچی ثابت ہوئی اور اس مشورے میں تاخیر کا خمیازہ مجھے کیا اور کیسے بھگتنا پڑا، وہ بس اللہ ہی جانتا ہے۔

مجھے مضمون نگاری سکھانے کی کوشش

ایک بار پھر وہی شفقتیں، وہی فکر مندی، وہی پدرانہ آرزوئیں، وہی علمی شغف، وہی ذرے کو خورشید بنانے کا جذبہ اس وقت دیکھنے کو ملا، جب حضرت الاستاذ نے ایک دن گھر سے قریب ایک مسجد میں عرب جماعت سے عصر بعد خطاب فرمایا، مجمع چوں کہ مخلوط تھا، عرب جماعت کے علاوہ مقامی بھی بہت سے افراد موجود تھے؛ اس لیے آپ نے عرب جماعت کی رعایت میں عربی زبان میں اور مقامی لوگوں کی رعایت میں اردو زبان میں خطاب فرمایا، چوں کہ آپ ٹھہر ٹھہر کر بالکل صاف بولا کرتے تھے؛ اس لیے میں نے حضرت والا کا مکمل خطاب بہ آسانی کاپی پر نوٹ کر لیا اور اگلے دن فل اسکیپ کاغذ پر صاف لکھ کر آپ کو بتایا کہ یہ کل عصر بعد کا آپ کا خطاب ہے، جسے میں نے نقل کر لیا ہے، آپ نے فرمایا کہ اب ایسا کرو کہ اسے اپنے الفاظ میں اپنے انداز پر لکھ کر لاؤ یعنی بات میری ہوگی، الفاظ اور ترتیب تمھاری ہوگی، چناں چہ میں نے فوراً یہ کام شروع کر دیا اور چند ایام آپ کی ہدایت کے مطابق لکھ کر دکھایا، آپ کمی کوتاہی کی طرف توجہ دلا کر بڑی شفقت کے ساتھ اس راہ کی بھی راہ نمائی فرماتے رہے۔

آپ کا ایک سوال اور میرا جواب

''بخاری شریف، جلد ثانی'' کی شرح فرماتے ہوئے جب آپ ''کتاب النکاح'' میں ''**باب ما یحل من النساء وما یحرم**'' (جن عورتوں سے نکاح جائز ہے اور جن عورتوں سے نکاح حرام ہے) پر پہنچے اور آیتِ شریفہ: ﴿**حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ أُمَّهٰتُكُمْ وَبَنٰتُكُمْ وَأَخَوٰتُكُمْ وَعَمّٰتُكُمْ وَخٰلٰتُكُمْ وَبَنٰتُ الْأَخِ وَبَنٰتُ الْأُخْتِ ....اھ**﴾ [النساء :۲۳] سامنے آئی، تو آپ نے مجھ

سے فرمایا کہ ایک سوال کا جواب دو! میں نے عرض کیا: جی! آپ نے فرمایا کہ آیتِ شریفہ میں ﴿بنٰت الاخ﴾ (بھتیجی) ﴿وبنٰت الاخت﴾ (بھانجی) کا تذکرہ الگ سے کیوں کیا گیا، جب کہ تیسرے نمبر پر صلبی فروع جو مرد پر حرام ہیں، بہن بھتیجی، بھانجی اور عورت پر جو حرام ہیں بھانجا، بھتیجا، وغیرہ کا تذکرہ آ گیا، اس طرح کہ جب بہن حرام ہے، تو اس کی فرع: بھانجا، بھانجی بھی حرام ہوں گی، اسی طرح جب بھائی حرام ہے، تو اس کی فرع: بھتیجا، بھتیجی بھی حرام ہوں گی؟

ظاہر ہے میں ایک معمولی درجے کا طالب علم تھا، مجھے اس سوال کا جواب کہاں سے معلوم رہتا؛ مگر فوراً ایسا لگا کہ کسی نے ذہن میں ایک جواب ڈال دیا (یہ حضرت ہی کی توجہ سے ہوا)، میں نے فوراً عرض کیا کہ حضرت ایک شبہے کے ازالے کے لیے الگ سے صلبی فروع کی فروع کا تذکرہ کیا گیا ہے، اگر چہ تیسرے نمبر پر ﴿وأخوٰتکم﴾ میں اس کا تذکرہ آ گیا ہے، آپ نے فرمایا کہ کیا شبہ ہوسکتا ہے؟ میں نے عرض کیا کہ آیتِ شریفہ میں چوتھے اور پانچویں نمبر پر بالترتیب ''عمات'' (پھوپیاں) اور ''خالات'' (خالائیں) جو کہ صلبی فروع ہیں، ان کی حرمت بیان کی گئی ہے؛ مگر ان کی جو فروع ہیں: پھوپی زاد بھائی، بہن، خالہ زاد بھائی بہن، چچازاد اور ماموں زاد بھائی بہن؛ وہ آپس میں ایک دوسرے پر حرام نہیں، ان کا آپس میں نکاح ہوسکتا ہے؛ اس لیے شبہ کا اندیشہ تھا کہ ﴿وأخوٰتکم﴾ میں بھی ''عمات'' اور ''خالات'' کی طرح صرف صلبی فروع ہی حرام ہوں، فروع کی فروع حرام نہ ہوں، اس شبہے کو دور کیا گیا کہ ''أخواتکم'' (تمہاری بہنیں) میں جس طرح صلبی فروع حرام ہیں، اسی طرح فروع کی فروع (بھتیجی، بھانجی، بھتیجا، بھانجا) بھی حرام ہیں۔

میرے اس جواب کو سن کر آپ مسکرائے اور فرمایا کہ ٹھیک کہا، پھر آپ نے اُسے نوٹ کے عنوان سے لکھ دیا، جب اگلے دن فجر بعد میں حاضر ہوا، تو آپ نے فرمایا کہ کل تم نے جو جواب دیا تھا، وہ میں نے لکھ دیا ہے، یہ آپ نے حوصلہ افزائی فرمائی؛ ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ آپ ہی کی توجہ سے میرے دل ودماغ میں یہ جواب آیا تھا، پہلے سے مجھے اس کا کوئی علم نہیں تھا، یہ بات ''تحفۃ القاری: ۱۰/ ۱۴۵'' پر نوٹ کے عنوان سے موجود ہے، بات ذرا علمی ہے؛ اس لیے خواص کو لطف آئے گا؛ مگر عوام شاید نہ سمجھ

سکیں؛ اس لیے زیادہ پریشان نہ ہوں، اس واقعے کا تذکرہ میں نے صرف اس لیے کیا ہے کہ اپنے شاگرد کی علمی لیاقت کا امتحان لینا بھی آپ ﷺ کی سنت ہے، جیسا کہ ''بخاری شریف'' کی حدیث میں آیا ہے کہ ایک مرتبہ آپ ﷺ ''جمار'' (کھجور کا گوند) تناول فرمارہے تھے، اِرد گرد حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کی جماعت موجود تھی، اس میں بڑے بڑے صحابہ بھی موجود تھے، اسی دوران آپ ﷺ نے اپنے صحابہ سے سوال کیا: بتاؤ! کون سا ایسا درخت ہے، جس کے پتے جھڑتے نہیں اور وہ درخت مسلمان کی مثال ہے؟

ابھی جیسا کہ عرض کیا گیا مجلس میں بڑے بڑے صحابہ موجود تھے، سب جنگلوں کے درختوں کے متعلق غور کرنے لگے کہ وہ کون سا درخت ہے، جو اس صفت کا ہے؛ مگر اتفاق سے ان میں سے کسی کے ذہن کی رسائی نہ ہوسکی؛ لہٰذا کسی نے کوئی جواب نہیں دیا، پھر آپ ﷺ نے خود ہی جواب ارشاد فرمایا کہ وہ کھجور کا درخت ہے۔

مجلس کے اختتام پر جب لوگ گھروں کو واپس ہوئے، تو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے اپنے والد حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ میرے ذہن میں آ گیا تھا کہ وہ کھجور کا درخت ہے؛ مگر وہاں بڑے بڑے صحابہ تشریف فرما تھے؛ اس لیے میری ہمت نہ ہوئی، اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اگر تم مجلس میں جواب دے دیتے، تو مجھے اتنی خوشی ہوتی کہ دنیا بھر کی نعمتیں پا کر بھی اتنی خوشی نہ ہوتی۔ یقیناً حضرت الاستاذ نے اپنے پاس پڑے رہنے والے اس طالب علم کا امتحان آپ ﷺ کی اسی سنت پر عمل کرنے کے لیے ہی لیا تھا۔

میرے فرزند: ''محمد انس'' سلمہ کا عقیقہ

اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے راقم کو جب پہلی اولاد عطا فرمائی، تو ارادہ ہوا کہ عقیقہ کرلیا جائے، میرے پاس صرف دس ہزار روپیہ تھا، ظاہر ہے اس میں بہ مشکل صرف ایک بکرا آ سکتا تھا، حضرت ہی سے سن رکھا تھا کہ اگر کسی کو دو بکرے کی سہولت نہ ہو سکے، تو لڑکے کا بھی عقیقہ ایک بکرے

سے ہوسکتا ہے؛ چناں چہ اس بات کو مزید اچھی طرح معلوم کرنے کے لیے میں نے آپ کو فون کیا کہ بچے کا عقیقہ کرنا ہے؛ مگر میری حالت دو بکرے کی متحمل نہیں ہے، کیا ایک بکرا کردوں؛ کافی ہو جائے گا؟ آپ نے فرمایا: کردو، ان شاء اللہ کافی ہو جائے گا، یہ کہہ کر آپ نے فون رکھ دیا، میں نے بھی ایک ہی کا ارادہ کرلیا، اَبھی فون رکھے ایک دو منٹ ہی ہوئے تھے کہ آپ کا فون آیا کہ ایک بکرا میری طرف سے لے لو، قاسم بھائی (یہ آپ کے صاحب زادے ہیں، ''مکتبہ حجاز'' کے مینیجر ہیں) کے ذریعے دس ہزار کی رقم میں بھیج رہا ہوں، اس طرح میرے اس معصوم کو یہ سعادت پیدائش کے ساتویں دن ہی حاصل ہوگئی کہ اس کے عقیقے میں حضرت والا نے آدھی رقم عنایت فرمائی (اے اللہ! میرے اس بچے کو خود میرے لیے بھی اور حضرت والا کے لیے بھی صدقۂ جاریہ بنا دیجیے، آمین)۔

البتہ جب آپ نے یہ معاملہ فرمایا، تو دیر تک دل میں یہ خیال آتا رہا کہ آپ کو بتانا نہیں چاہیے تھا اور یہ خیال ایسا ذہن میں بیٹھ گیا کہ جب دوسرے بچے: ''محمد صالح'' کی پیدائش ہوئی، تو اس کے عقیقے کے دن اپنے تمام قریبی رشتے داروں کو اطلاع دی؛ مگر آپ کو فون کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔

''انس'' بات نہیں کرتا

اسی بچے ''محمد انس'' کا یہ واقعہ بھی پیش آیا کہ یہ تین سال کا ہو جانے کے بعد بھی ذرا بھی بات نہیں کرتا تھا، گھر میں تمام لوگوں کو بڑی تشویش لاحق ہوگئی، ہلکا پھلکا علاج بھی شروع کرادیا؛ مگر مطلق فائدہ نہ ہونے کی وجہ سے تشویش برقرار رہی؛ بل کہ بڑھنے لگی، ایک دن اچانک خیال آیا کہ حضرت الاستاذ کو بتانا چاہیے؛ چناں چہ آپ کو فون کیا اور بچے کی صورتِ حال ذکر کر کے تشویش کا اظہار کیا، اس پر آپ نے فرمایا کہ پریشانی کی کوئی بات نہیں، اس کی قوتِ ناطقہ کم زور ہے؛ لہٰذا دو کام کرو: ایک تو یہ کہ بادام پیس کر اس کی زبان کے نیچے رکھو، دوسرے یہ کہ اسے چھوٹے بچوں کے ساتھ مکتب میں بیٹھاؤ، پڑھنے کے لیے نہیں؛ بل کہ وہاں اپنے ہم عمر بچوں کو بات کرتا دیکھ کر یہ بھی بات کرنے کی کوشش کرے گا، آپ کے مشورے پر عمل کیا، چند ہی دنوں میں بچے کی زبان کھلنے لگی،

مفردات اور ٹوٹے پھوٹے جملے بولنا شروع کر دیا؛ مگر کم، جس سے تشویش تو ختم ہوگئی؛ مگر اپنے ہم عمر بچوں کی طرح چوں کہ نہیں بول پا تا تھا؛ اس لیے بچے پر رحم بہت آتا تھا، اتفاق ایسا ہوا کہ کسی طرح بچے کی اس حالت کا علم حضرت مہتمم صاحب زید مجدہم (حضرت اقدس مولانا مفتی محمد شعیب اللہ خان صاحب دامت فیوضہم) کے گھر میں ہوگیا، وہاں سے فوراً میرے گھر میں بتایا گیا کہ حضرت مہتمم صاحب (دام اقبالہ) شہد پر دم کر کے دیتے ہیں، اس سے ایسے بچوں کو بڑا فائدہ ہوتا ہے؛ چناں چہ میں آپ کے پاس شہد لے کر پہنچ گیا، بچے کی صورتِ حال سے آگاہ کیا، آپ نے شہد پر دم کر دیا، الحمد للہ! جوں ہی پابندی سے بچے کو شہد چٹانا شروع کیا، تیزی سے افاقہ ہوتا چلا گیا، اب بچہ الحمد للہ اپنے مافی الضمیر کو ادا کرنے میں کوئی خاص تکلیف محسوس نہیں کرتا۔ **فجزاهم الله تعالیٰ عني خير الجزاء .**

آپ کا ایک نہایت ہی قیمتی مشورہ

بڑا بچہ ''محمد انس'' اَبھی دس مہینے کا بھی نہیں ہوا تھا کہ دوسری اولاد کی خوش خبری محسوس ہوئی؛ مگر چوں کہ مسافرت کی زندگی ہے، والدہ، بھائی، بہن یا دیگر کوئی بھی قریبی رشتے دار ساتھ تو کیا، آس پاس میں بھی نہیں، جو دکھ درد کے وقت کچھ تعاون کر سکے یا ایسی کسی تکلیف اور پریشانی کے وقت ہم خود ان کے پاس جا کر اپنے غم کو ہلکا کر سکیں، ہر حال میں بیماری ہو کہ پریشانی، اہلیہ کو گھر کے سارے کام کرنا ہی تھا، اُدھر پہلا بچہ ابھی بہت چھوٹا تھا؛ اس لیے گھر میں یہ طے ہوا کہ دوسری اولاد اَبھی حاصل نہ کی جائے، میں نے کہا ٹھیک ہے؛ مگر میں ایک مرتبہ حضرت الاستاذ سے بتا کر آپ کی رائے معلوم کر لیتا ہوں، چناں چہ آپ کو فون کیا، ساری صورتِ حال سے آگاہ کیا، تو آپ نے فرمایا کہ اب جو ہو گیا، ہو گیا؛ پہلے ہی احتیاط کرنی تھی، اب مسئلے کی رو سے خود جانو کیا حکم ہے؟ مگر میں یہ بتا تا ہوں کہ جب ایک مرتبہ اِسقاط کرایا جاتا ہے، تو پھر بعد میں حمل رکنا بہت دشوار ہوتا ہے؛ لہٰذا اللہ کا نام لے کر آنے والے کو آنے دو، ان شاء اللہ خیر ہوگا زیادہ فکر نہ کرو!!

ہم راضی ہیں

حضرت کے مشورے پر مجھے تو عمل کرنا ہی تھا؛ مگر ظاہر ہے کہ پریشانی تو گھر میں تھی؛ لیکن بہ ہر حال میں نے بالکل صاف صاف حضرت کا مشورہ گھر میں سنایا، مشورہ سنتے ہی بغیر تامل کے فوراً جواب ملا کہ ”بس اسی میں خیر ہے، ہم راضی ہیں، حضرت کے مشورے کے آگے ہم نہیں جائیں گے“، الحمدللہ جب گھر سے یہ جواب ملا، تو میری خوشی مزید بڑھ گئی اور اللہ پاک نے تمام مراحل بآسانی مکمل کرادیے۔

”سالے“ سے تم بھاگ رہے تھے، اب ”صالح“ تمھارے گھر میں

ایک لطیفہ: مذکورہ بچے کی پیدائش کی خوش خبری دینے کے لیے میں نے حضرت کو فون کیا، خوش خبری دینے کے بعد نام کے متعلق بتایا کہ میں نے ”محمد صالح“ نام رکھنا سوچا ہے، آپ نے فرمایا کہ بہتر ہے، رکھ لو، پھر آپ نے ہنستے ہوئے مزاحاً فرمایا کہ ”سالے“ سے تم بھاگ رہے تھے، اب ”صالح“، تمھارے گھر میں آ گیا، یہ حضرت والا نے بڑا لطیف مزاح فرمایا کہ شروع میں مجھے میرے سالے صاحب سے کچھ زیادہ ذہنی موافقت نہیں تھی، اس کا علم آپ کو تھا، اسی بنیاد پر آپ نے یہ جملہ ارشاد فرمایا۔

اس کو سمجھنے کے بعد یہ سمجھئے کہ اس میں لطف یوں آئے گا کہ اردو بولنے چالنے میں تجوید کی زیادہ رعایت ملحوظ نہیں ہوتی اور نہ ہی ہونی چاہیے، اس لحاظ سے ”سالے“ اور ”صالح“ کا تلفظ تقریباً ایک ہی طرح ہوگا، یہ آپ نے مزاح فرمایا اور یہ ہے سنت پر عمل کہ ایسا مزاح جو دل آزار نہیں؛ بل کہ فرحت بخش اور محبت آمیز ہے۔

ڈوبتی نیّا پار لگا دی

میری خوش قسمتی کہیے یا بد قسمتی، میرا نکاح تعلیمی زمانے میں ”تخصص فی الحدیث“ کے دوسرے سال ہوگیا؛ مگر اس وقت کچھ بدخواہوں کی وجہ سے اور کچھ اپنوں کے نامناسب عمل کی وجہ سے سسرال

والوں سے معمولی نااتفاقی پیدا ہوگئی،(اہلیہ کا قیامِ اِن دنوں مسلسل ان کے والدین کے یہاں ہی تھا) جوایام کے گزرنے کے ساتھ ساتھ طول پکڑتی گئی، یہاں تک کہ جب میں ’’مسیح العلوم، بنگلور‘‘ مدرس ہوکرآ گیا،توبات یہاں تک اوراتنی خراب ہوگئی کہ میں نے اپنے طور پر یہ طے کرلیا کہ روز روز کے اختلاف سے بہتر یہی ہے کہ سلسلہ دراز ہورہاہے، اہلیہ بھی ہر معاملے میں ان ہی لوگوں کا ساتھ دیتی ہے؛ لہٰذا اس رشتے کو ہی ختم کرلینا چاہیے؛ تاکہ ہم دونوں ہی اپنی اپنی جگہ آرام سے رہیں؛ مگر ظاہر ہے کہ حضرت سے مشورے کے بغیر ایک قدم بھی میں آگے نہیں بڑھا سکتا تھا؛ چناں چہ میں نے اس سلسلے میں ایک تفصیلی خط لکھ کرآپ کو بھیجا، اپنے ارادے سے بھی آگاہی دی؛ مگر اخیر میں یہ لکھا کہ آخری بات وہی ہوگی، جوآپ فرمائیں گے، آپ نے پہلے خط ملاحظہ فرمایا، اس کے بعد حضرت مفتی محمد نعمان صاحب سے کہا کہ تم بھی اس خط کو پڑھو، تم سے ایک کام لینا ہے؛ چناں چہ اُنھوں نے بھی پڑھا، اس کے بعد آپ نے مفتی محمد نعمان صاحب سے فرمایا کہ اب تم جناب مفتی محمد شعیب اللہ خان صاحب کوفون کرواور میرے حوالے سے یہ درخواست کرو کہ وہ مرشد کے لیے ایک گھر کا انتظام کردیں، وہ اپنی بیوی بچے کو سسرال سے بلالے اور بنگلور اپنے ساتھ رکھے، سارا اختلاف ختم ہوجائے گا، اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے حضرت مہتمم صاحب زید مجدہم کو، کہ مفتی محمد نعمان صاحب کا فون آتے ہی آپ نے مجھے اجازت مرحمت فرمادی کہ آپ گھر تلاش کریں؛ بل کہ یہاں تک فرمایا کہ میں بھی دیکھوں گا، اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ فوراً ہی بالکل ایک نیا گھر کرائے پر مل گیا اور آناً فاناً حضرت کے مشورے کے مطابق میں نے اپنے اہلِ خانہ کو بنگلور بلالیا۔

قلندر ہرچہ گوید؛ دیدہ گوید

الحمدللہ! اس دن سے آج تک ہم جس قدر آرام اور باہمی الفت کے ساتھ ہیں کہ اس کا اندازہ کرنا سابقہ حالات کے تناظر میں میرے لیے دشوار ہے، پردیس کی زندگی ہے، تنہائی اور چھوٹے چھوٹے بچوں کے باوجود، تمام گھریلو کام احسن طریقے پر انجام دینا، بچوں کی بھرپور دیکھ ریکھ کرنا، مدرسے کے وقت کے لحاظ سے بالکل وقت پر کھانا، پینا اور آرام کا خیال رکھنا، پورے ہفتے حتیٰ

الامکان ایک چھوٹی سی چیز کے لیے بھی نہ ٹوکنا، جامعہ کے کام کے لیے پوری طرح فارغ کر دینا، تھوڑی چیزوں میں نہایت عمدگی کے ساتھ بہتر سے بہتر کھانے پینے کا انتظام کر لینا، تنہائی کے باوجود مہمانوں کی آمد پر خوش دلی سے عمدہ سے عمدہ انتظام کے لیے تیار ہو جانا وغیرہ؛ ایسی چیزیں ہیں کہ جس سے الحمدللہ دل بہت خوش رہتا ہے اور اپنے کام میں پوری یکسوئی حاصل رہتی ہے، اِدھر سسرالی رشتے داروں میں سے کسی سے بھی کوئی نا اتفاقی نہیں، باقی دنیا میں سو فی صد کس کا کس سے مزاج ملتا ہے؟ اور پھر یہ کہ کمی کوتاہی کس میں نہیں؟

خیر! اس طرح آپ نے ایسے سنگین حالات میں جب کہ کشتی بھنور میں پھنس چکی تھی، اپنے قیمتی صلاح کے ذریعے میری ڈوبتی نیا کو بہ آسانی پار لگا دیا اور اس طرح ہم نا اتفاقی کے خطرناک سمندر سے نکل کر پیار و محبت، اتحاد و اتفاق کے پر اطمینان ساحل پر آ کھڑے ہوئے۔

''مدراس'' حاضری اور بیعت کی درخواست

حضرت الاستاذ کا مزاج یہ تھا کہ طلبہ کو آپ بیعت نہیں کرتے تھے، متعدد مرتبہ راقم نے دیکھا کہ اگر کوئی درخواست کرتا، تو آپ منع فرما دیتے؛ اس لیے باوجودے کہ مجھے اپنی اصلاح کی سخت ضرورت تھی اور دل پوری طرح آپ سے اصلاحی تعلق قائم کرنے کے سلسلے میں مطمئن بھی تھا؛ مگر میں خاموش رہتا تھا، مناسب وقت کا انتظار کر رہا تھا؛ چناں چہ جب ۱۴۳۸ھ میں ''ادارۂ مباحث الفقہیۃ'' کے سمینار میں ''مدراس'' آپ کے تشریف لانے کا علم ہوا، تو پختہ ارادہ کر لیا کہ اس راہ میں بھی آپ ہی سے راہ نمائی حاصل کرنی ہے، چناں چہ اپنے کرم فرما جناب مفتی محمد نعمان صاحب اور مفتی اشتیاق احمد صاحب سے مشورہ کیا، ان دونوں حضرات کی بھی رائے یہی ہوئی، پھر میں نے ان حضرات سے کہا کہ میں استخارہ کر رہا ہوں، باقی آپ دونوں حضرات حضرت الاستاذ کے پاس میری سفارش کیجیے گا؛ کیوں کہ آپ جلدی بیعت نہیں فرماتے ہیں، دونوں حضرات نے کہا کہ تم ''مدراس'' آ جاؤ، ہم سفارش کریں گے؛ لہٰذا میں نے ٹکٹ بنا لیا، اُدھر استخارہ پابندی سے کرنے لگا، اسی دوران خواب

دیکھا کہ آپ مجھے گلے لگائے ہوئے ہیں، پوری طرح اطمینان ہوگیا،فون ہی کے ذریعے اپنے ان دونوں کرم فرماؤں کو بھی خواب سنا دیا اور پھر وقت آنے پر مدراس پہنچ گیا،پہنچتے ہی جیسے ہی آپ کی نگاہ مجھ پر پڑی،فوراً آپ نے گلے سے لگالیا اور فرمایا: جاؤ پہلے کھانا کھاؤ، یہ عشا کا وقت تھا، جب رات کے گیارہ بارہ بج گئے ، ملاقات کرنے والے حضرات رخصت ہوگئے،تو میرے ان دونوں کرم فرماؤں نے میرے متعلق آپ سے گفتگو فرمائی اور میری حاضری کے مقصد کو بتایا اور یہ بھی بتایا کہ اس نے استخارہ بھی کیا ہے اور خواب میں آپ نے اُسے گلے لگایا ہے،اس پر آپ نے ہنس کر فرمایا کہ ’’آتے ہی اسے گلے تو لگا لیا‘‘ ،اب خواب پورا ہوگیا، پھر ان دونوں حضرات نے فرمایا کہ آپ اسے واپس نہ بھیجئے، بیعت کر لیجیے،اب آپ خاموش ہوگئے، کچھ نہیں فرمایا،بس ہم سب کو یقین ہوگیا کہ ان شاءاللہ اب کام ہوجائے گا۔

فجر سے پہلے آپ کے کمرے میں حاضری

بیعت کی درخواست پر جب آپ خاموش ہوگئے اور اسی خاموشی پر مجلس ختم ہوگئی،تو ہمیں تقریباً یقین سا ہوگیا کہ آپ بیعت فرمالیں گے؛ لہٰذا ہم مناسب وقت کا خاموشی سے انتظار کرنے لگے، اگلے دن جمعہ تھا، فجر سے پہلے ہی میں آپ کے کمرے پہنچ گیا، آپ فجر کی نماز کے لیے وضو فرما رہے تھے، اَبھی نماز میں دیر تھی، جب آپ وضو سے فارغ ہوگئے، کپڑے وغیرہ پہن لیے،تو سب سے پہلے مجھے فرمایا کہ دیکھو مقصود بیعت نہیں ہے؛ بل کہ اعمالِ بیعت ہیں؛ لہٰذا کچھ اعمال بتاتا ہوں شروع کرو،اس پر پابندی کرو، ہوا تو کبھی یہ رسمی بیعت بھی کرلیں گے،خوشی کی انتہا نہ رہی؛ کیوں کہ جو مقصود تھا، وہ حاصل ہو رہا تھا۔

راہِ سلوک کا سفر تدریجاً شروع

راہِ سلوک میں بھی اس طرح اللہ پاک نے محض اپنے فضل وکرم سے آپ کے دامن سے وابستہ فرمادیا، الحمدللہ تدریجاً یہ سفر جاری ہوگیا،اس سلسلے میں بھی بڑی فکر فرماتے ، جو بھی اعمال بتاتے اس

سے پہلے تدریسی مصروفیت معلوم کرتے، اس کے بعد تھوڑے اعمال بڑھاتے، بار بار فرماتے کہ تدریس بھی تو نیک عمل ہی ہے، اس میں زیادہ وقت صرف کرو، قرآنِ پاک کی تلاوت پر خاص زور دیتے، ذکر سنت کے مطابق آہستہ کرنے کی بار بار ترغیب دیتے، جیسے ہی میں ''مسیح العلوم'' سے اس سلسلے کا خط بھیجتا، فوراً اپنے صاحب زادے: حسن بھائی کے ذریعے جواب بھیج دیتے، جلبِ منفعت سے زیادہ دفعِ مضرت پر نگاہ رکھتے یعنی کوشش یہ ہوتی کہ اچھے اعمال اگرچہ کم ہوں؛ مگر باطنی رذائل کا زیادہ سے زیادہ ازالہ ہو۔

جس کی غیبت ہورہی ہو، اس کی تعریف کرنے لگو

جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا، آپ یہ سننا زیادہ پسند نہیں کرتے تھے کہ کونسا وظیفہ کتنا زیادہ ہورہا ہے؛ بل کہ آپ زیادہ تر دو باتیں چاہتے تھے، ایک یہ کہ جو وظیفہ دیا گیا ہے، اگر چہ وہ تھوڑا ہو؛ مگر اس پر پابندی ہو (اور عمل گر چہ مختصر ہو؛ مگر اس پر پابندی آسانی نہیں)، دوسرے یہ کہ سالک زیادہ سے زیادہ اپنے رذائل اور باطنی کمزوری کو بتا کر اس کا علاج حاصل کرے، آپ کے اسی مزاج کو سامنے رکھ کر ایک مرتبہ میں نے خط لکھا کہ حضرت بہت کوشش کے باوجود بھی ایسا ہوتا ہے کہ کبھی خود بھی غیبت میں ملوث ہوجاتا ہوں اور اگر خود نہیں، تو سننا تو ضرور پڑتا ہے، اس موقع پر آپ نے یہ نسخہ بتایا کہ جب ایسی نوبت آجائے، تو فوراً کسی طرح مجلس سے اُٹھ جاؤ یا یہ کہ اگر کسی وجہ سے اٹھنا نہ ہو سکے، تو فوراً کسی نہ کسی طرح گفتگو کا رخ بدل دو اور جس کی غیبت ہورہی ہے اس کی تعریف شروع کردو، اس طرح ان شاء اللہ اس بیماری سے نجات مل جائے گی۔

محترم قارئینِ کرام! آپ کو اکتاہٹ؛ بل کہ اذیت میں ڈالے رہنے کا سلسلہ (آپ کے متعلق اپنے ذاتی واقعات کے تناظر میں پیدا ہونے والے قلبی احساسات وتاثرات کے تذکرے کا سلسلہ) اب تقریباً یہیں ختم کیا جاتا ہے اور اب آپ کی مزید متعدد متفرق خوبیوں کو مختلف عنوانات سے ذکر کرنے کی کوشش کی جاتی ہے؛ چوں کہ آپ کا سب سے محبوب مشغلہ علمی انہماک اور اس کے سلسلے کی

جدوجہد تھی؛ اس لیے پہلے ایسے ہی واقعے کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

طالبِ علمی کے زمانے میں ایک طالبِ علم سے آپ کا علمی تنافس

تعلیمی انہماک کا ایک مرتبہ آپ نے خود ایک بالکل عجیب وغریب واقعہ سنایا کہ ''مظاہر علوم'' میں طالبِ علمی کے زمانے میں ایک طالبِ علم سے پڑھنے میں مقابلہ ہو گیا، رات دن دونوں پڑھتے رہتے، حضرت نے فرمایا کہ یہاں تک کہ کئی راتیں مسلسل گزر گئیں، جس میں میں بالکل نہیں سویا بس رات دن اکثر اوقات پڑھنا ہی پڑھنا رہتا تھا۔

راقم عرض کرتا ہے کہ طلبہ اب تو فضول چیزوں میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں؛ مگر ایسی چیزوں میں تنافس کی طرف ان کا ذہن منتقل نہیں ہوتا، جب کہ ایسی چیزوں میں اُنھیں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرنی چاہیے؛ تا کہ ان کا علمی فائدہ ہو، استعداد میں اضافہ وترقی ہو۔

آپ کے علمی انہماک کا ایک عجیب واقعہ، کیوں آئے ہو؟

ہر وقت علمی کاموں میں مشغول رہنا، یہ آپ کا محبوب ترین مشغلہ تھا اور جب آپ علمی کاموں میں مشغول ہوتے، تو پھر بالکل اس میں مگن ہو جاتے؛ اسی لیے پاس بیٹھے ہوئے کو مشغول ہونے سے پہلے ہی رخصت فرما دیتے اور پھر پوری یکسوئی کے ساتھ غایت درجے انہماک کے ساتھ اپنے کام میں مصروف ہو جاتے، موسم اور حالات کا اتار چڑھاؤ کبھی بھی آپ کے کاموں اور یکسوئی میں خلل انداز نہ ہوتا، چناں چہ آپ کے علمی انہماک ہی کا ایک عجیب وحیرت انگیز واقعہ یہ ہے کہ جس دن آپ کی صاحب زادی کا نکاح تھا، ممبئی سے بارات آئی ہوئی تھی، اس دن آپ کے برادرِ عزیز: استاذِ محترم حضرت اقدس مولانا مفتی محمد امین صاحب پالن پوری زید مجدہم (آپ سے راقم نے ''مشکاۃ (ثانی)'' اور ''موطأ امام محمد رحمہ اللہ'' پڑھی ہے، **جزاہ اللہ تعالی عني خیر الجزاء**) تقریب کی مناسبت سے دولت کدے پر حاضر ہوئے، آپ اس وقت ''رحمۃ اللہ الواسعۃ'' کی تصنیف میں

مصروف تھے، اتنا علمی انہماک ہوگیا اور اس قدر لکھنے میں پوری طرح بالکل مست ہوگئے اور کھو گئے کہ اس وقت ذہن میں نکاح کی تقریب کا بالکل خیال ہی نہیں رہا اور جیسے ہی حضرت مفتی محمد امین صاحب دامت برکاتہم پر نظر پڑی فوراً پوچھا: کیوں آئے ہو؟ کیسے آنا ہوا؟ اس پر جب حضرت مفتی محمد امین صاحب نے فرمایا کہ آج عصر بعد ''فاطمہ'' کا نکاح ہے نا!، یہ سن کر فوراً ایک دم سے آپ کا ذہن متوجہ ہوا۔

مذاہبِ ائمہ کاغذ پر لکھنا

ایک موقع پر (غالباً امتحان کے موقع پر) ہم نے عرض کیا کہ حضرت ہمیں ائمہ کے مسالک یاد نہیں رہتے، بار بار یاد کرتے ہیں بھول جاتے ہیں، جب کہ آپ ہیں یا ہمارے دیگر اساتذۂ کرام ہیں، گھنٹوں سبق پڑھاتے رہتے ہیں اور محسوس ہوتا ہے کہ تمام ائمہ کے مسالک بالکل ان کے نوکِ زبان ہیں، اس پر آپ نے فرمایا کہ بڑی محنت کرنی پڑتی ہے؛ تب جا کر یہ یاد رہتے ہیں اور پھر آپ نے فرمایا کہ ''راندیر'' میں تدریس کے زمانے میں سبق سے پہلے میں مسالکِ ائمہ کو الگ سے کاغذ پر لکھ لیتا تھا اور چلتے پھرتے انھیں ذہن نشین کرتا رہتا تھا، جب سبق ہوجاتا، تو پھر اسے پھاڑ کر پھینک دیتا، اس پر مجھے ذرا اَچنبھا ہوا اور پوچھا: حضرت! آپ لکھے ہوئے کو پھاڑ کیوں دیتے تھے؟ تو آپ نے فرمایا کہ اس اندیشے سے کہ کہیں لکھے ہوئے پر ہی اعتماد کر کے نہ بیٹھ جاؤں۔

ابا کا ''حدثنا'' شروع

حضرت الاستاذ کے تدریس کی ایک خاص بات یہ تھی کہ آپ کو جو سبق پڑھانا ہوتا تھا، اس کی اس حد تک تیاری فرماتے تھے کہ تقریباً کتاب کی عبارت آپ کو یاد ہوجاتی تھی، ''ہدایہ'' کے متعلق تو راقم نے خود حضرت سے سنا کہ ''میں مکمل عبارت یاد کر کے پڑھانے جاتا تھا، کتاب صرف برائے نام میرے سامنے ہوتی تھی''، اسی سلسلے کا ایک دل چسپ واقعہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ آپ نے فرمایا کہ ''ترمذی شریف'' جب مجھ سے متعلق ہوئی، تو میں اتنی محنت کرتا تھا کہ جب پورے سبق کو خوب اچھی

طرح حل کر لیتا تھا، تورات کے بارہ بجے کے بعد اس کی سندوں کو یاد کرتا تھا، چناں چہ جب میرا یہ عمل شروع ہوتا، تو میری وہ بچی جو وفات پا گئی، اپنی امی سے جا کر کہتی کہ امی! ابا کا ''**حدثنا**'' شروع ہوگیا۔ احادیثِ مبارکہ کی سندوں میں جب ایک راوی اپنے سے اوپر والے دوسرے راوی سے اپنا سننا بیان کرتا ہے، تو **حدثنا، أخبرنا، أنبأنا، حدثني، أخبرني، أنبأني** جیسے الفاظ استعمال کرتا ہے اور چوں کہ ایک ایک سند میں تین تین، چار چار، پانچ پانچ یا اس سے بھی زیادہ راوی ہوا کرتے ہیں، تو ظاہر ہے سندوں کو یاد کرتے ہوئے بار بار ''**حدثنا**'' کا لفظ آئے گا ہی، اسی کو جب وہ معصوم بچی سنتی تھی، تو اسے کیا پتہ کہ یہ ''**فناء في العلم**'' کس دُھن میں ہے؟ بس وہ اپنے معصومانہ انداز میں امی سے جا کر کہتی کہ امی! ابا کا ''**حدثنا**'' شروع ہوگیا۔

میرے پاس مت آؤ

حضرت مولانا غلام محمد صاحب وستانوی زید مجدہم جب اکثرِ رائے کے ذریعے دارالعلوم کے نئے مہتمم منتخب ہوئے، اس وقت چند طلبہ نے احتجاج کیا، ان ہی دنوں عصر کے بعد طلبہ کی ایک جماعت آپ کے پاس آئی اور احتجاج کرنے والے طلبہ کی شکایت کی کہ یہ طلبہ ہو کر ایسا کر رہے ہیں، ان کی ہمت بڑھ گئی، تو کل کو پھر کسی کے خلاف کچھ کریں گے؛ لہٰذا ہم آپ کے پاس مشورے کے لیے آئے ہیں، آپ نے بالکل ناراضگی کے ساتھ فرمایا کہ مجھے میرے کام میں مشغول رہنے دو، تم لوگوں کو جو کرنا ہے کرو، میرے پاس مت آؤ، مجھے اپنے کام سے بالکل فرصت نہیں، آپ کا یہ جواب سن کر وہ مجلس سے چلے گئے، آپ پڑھنے لکھنے کے علاوہ کسی چیز میں پڑ کر اپنے ایک لمحے کو بھی ضائع کرنا بالکل ہی پسند نہیں فرماتے تھے۔

لوگ اچھا نہیں سمجھیں گے

یاد رہے کہ حضرت الاستاذ حضرت اقدس مولانا ریاست علی صاحب بجنوری اور حضرت الاستاذ مفتی صاحب رحمہما اللہ؛ دونوں بزرگوں کی اہلیۂ محترمہ کی وفات ایک ہی دن ہوئی ہے، پہلے حضرت مفتی

صاحب رحمہ اللہ کی اہلیہ کا، پھر حضرت بجنوری رحمہ اللہ کی اہلیہ کا، خیر! جس دن وفات ہوئی، اس دن جب ''بخاری شریف'' کے گھنٹے کا وقت ہوا، تو ایسا دینی خدمت کا انہماک اور ذہن و دماغ پر اس کا تسلط اور سبق ناغہ نہ ہونے کی فکر تھی کہ اس دن بھی آپ نے سبق پڑھانے کا ارادہ فرمالیا اور فرمایا کہ اچھے کام کو کیوں چھوڑ دوں؟ اسی کے ذریعے ایصالِ ثواب کر دوں گا؛ مگر اس وقت تعزیت کے لیے محدثِ عصر حضرت علامہ سید انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ کے حفیدِ محترم: حضرت مولانا خضر احمد صاحب مسعودی کشمیری (شیخ الحدیث دارالعلوم [وقف] دیوبند) آئے ہوئے تھے، اُنھوں نے کہا کہ حضرت آپ کی بات اور سوچ اپنی جگہ بالکل درست ہے؛ مگر معاشرے میں اچھا نہیں سمجھا جائے گا، لوگ اچھا نہیں سمجھیں گے؛ لہٰذا آپ ارادہ ملتوی کر دیں اور سبق کو نہ جائیں، ان کے اس مشورے کو آپ نے پسند فرمایا اور فرمایا کہ ہاں یہ بات قابلِ توجہ ہے؛ لہٰذا سبق کو نہیں جانا چاہیے اور پھر آپ نے یہ کہہ کر ارادہ ملتوی کر دیا؛ ورنہ شاید و باید ہی ایسے ایام ہوں گے کہ آپ دیوبند میں ہوں اور آپ کا سبق نہ ہوا ہو۔

''بخاری شریف'' سے شغف کا عالم

آپ کی اہلیہ محترمہ کی وفات کے بعد ایک موقع پر کسی قریبی تعلق رکھنے والے نے عرض کیا کہ حضرت! امی جان کی تو وفات ہو چکی ہے، آپ کی بھی طبیعت اچھی نہیں رہتی اور بعض خدمت ایسی ہوتی ہے کہ وہ بیوی ہی کر سکتی ہے، کوئی دوسرا نہیں؛ تو کیا ہی بہتر ہوتا کہ آپ کوئی مناسب رشتہ دیکھ کر نکاح فرما لیتے، اس پر آپ نے فرمایا کہ بات صحیح ہے کہ بعض خدمت ایسی ہوتی ہے کہ جو بیوی ہی کر سکتی ہے؛ مگر الحمد للہ میرے بچے میرے لیے کافی ہیں، وہ میری بہت خدمت کرتے اور خیال رکھتے ہیں، اس لیے مجھے اس لحاظ سے تو نکاح کی ضرورت نہیں اور رہی بات استیناس کی، تو اس کے لیے ''بخاری شریف'' کافی ہے، جب ''بخاری شریف'' میرے سامنے ہوتی ہے، تو پھر مجھے کسی کا خیال نہیں آتا، اس دوران آپ ''تحفۃ القاری'' کے کام میں مصروف تھے۔

سنت کی عظمت

۱۰ تا ۱۲/ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۸ھ مطابق ۸ تا ۱۰/فروری ۲۰۱۷ء ’’حج ہاؤس، مدراس‘‘ میں ’’ادارۃ المباحث الفقہیہ، جمعیۃ علماء ہند‘‘ کا تیرھواں فقہی اجتماع منعقد ہوا، جس میں حضرت الاستاذ کی بھی مبارک آمد ہوئی، بنگلور سے ’’مدراس‘‘ قریب ہونے کی وجہ سے میں نے ’’مدراس‘‘ جانے کا فیصلہ کرلیا (اور ایک عظیم مقصد کو بھی سامنے رکھ لیا، جس کا تذکرہ ’’مدراس حاضری اور بیعت کی درخواست‘‘ کے عنوان کے تحت گذر گیا) جمعرات کی شام کو میں وہاں پہنچ گیا، اگلا دن جمعے کا تھا اور یہ سمینار کا بھی آخری دن تھا، رات کا قیام حضرت مولانا مفتی محمد نعمان صاحب کے کمرے میں ہوا، صبح فجر سے پہلے ہی اٹھ کر آپ کے کمرے پہنچ گیا، فجر کی نماز کی تیاری کے بعد میں حضرت والا کے ساتھ مسجد والے فلور پر آیا، آپ پہلی صف میں تشریف فرما ہوئے اور میں آپ کے پیچھے کی صف میں بیٹھ گیا، فجر کی نماز کی امامت استاذِ محترم حضرت اقدس قاری محمد عثمان صاحب (استاذ دارالعلوم دیوبند وصدر جمعیۃ علمائے ہند[م]) نے فرمائی اور جیسا کہ علمائے دیوبند کی شان ہے اتباعِ سنت، اس کے مطابق آپ نے فجر کی پہلی رکعت میں ’’سورۂ الم سجدہ‘‘ مکمل اور دوسری رکعت میں ’’سورۂ دھر‘‘ مکمل تلاوت فرمائی (ماشاء اللہ)، چوں کہ حضرت الاستاذ مفتی صاحب کے پیروں میں سخت تکلیف رہتی تھی، نہ زیادہ کھڑا رہا جاتا تھا، نہ چلا جاتا تھا، تو اس لیے مجھے فکر ہوئی کہ کہیں گر نہ جائیں، خیر! الحمد للہ نماز آپ نے کھڑے ہونے کی حالت میں مکمل فرمائی، بعد نماز کمرے کی طرف واپس آتے ہوئے میں نے اپنا خیال ظاہر کیا کہ حضرت قرأت تو لمبی ہوگئی، مجھے اندیشہ ہونے لگا تھا کہ کہیں آپ گر نہ جائیں، کیا اچھا ہوتا کہ قرأت قدرے مختصر ہوجاتی! میرے اس کہنے پر آپ نے ارشاد فرمایا کہ اتنی بات تو ٹھیک ہے کہ پیر تھکنے لگ گئے تھے؛ مگر اس طرح اگر سرِ عام سنتوں کو چھوڑا جائے گا، تو پھر سنت کی عظمت لوگوں کے دلوں میں کیا رہ جائے گی؟ اللہ اکبر! کس قدر سنت کی عظمت سے دل معمور تھا اور ایسی تکلیف میں بھی سنت پر عمل کا کیا جذبہ تھا!! آج اکثر وبیشتر مساجد میں ایسا ہورہا ہے کہ

حضراتِ ائمہ کرام جمعہ کی فجر میں یہ مسنون قرأت نہیں کرتے، جب کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق فرماتے ہیں کہ ''**کان یدیم علی ذلک**'' (آپ ہمیشہ اس کا اہتمام فرماتے تھے) یعنی جمعے کی فجر میں اِن دونوں سورتوں کو پابندی سے پڑھا کرتے تھے۔

ٹرین نکل جائے تو نکل جائے؛ مگر دین کا مذاق نہ اڑے

حضرت الاستاذ نے فرمایا کہ ایک مرتبہ آپ سفر میں تھے، اسٹیشن پر کہیں ٹرین رکی، تو نیچے اتر کر آپ نماز پڑھنے لگے، اتنے میں ٹرین چلنے لگ گئی، اسٹیشن پر موجود بہت سے غیر مسلم میری طرف دیکھنے لگ گئے کہ یہ اب کیا کرتے ہیں؟ مجھے احساس ہوگیا کہ یہ لوگ مجھے دیکھ رہے ہیں، دل میں خیال آیا کہ اگر مسئلے پر عمل کرتے ہوئے نیت توڑ کر جلدی سے ٹرین پر سوار ہو جاتا ہوں، تو یہ غیر مسلم ہنسیں گے اور کہیں گے کہ دیکھو اِن کا مذہب اور ان کی عبادت کیسی ہے کہ درمیان سے چھوڑ کر ٹرین کے لیے بھاگے اور اگر نماز مکمل کرتا ہوں، تو ٹرین نکل جاتی ہے، پھر پتہ نہیں کب ٹرین آتی ہے؟ خیر! میں نے دل ہی دل میں یہ طے کرلیا کہ ٹرین نکل جائے، تو نکل جائے؛ مگر نماز توڑ کر اِن غیر مسلموں کو اپنے دین پر ہنسنے کا موقع نہیں دوں گا؛ لہٰذا ٹرین جاتی رہی اور میں بہ اطمینان نماز میں مشغول رہا اور لوگ ٹرین چھوٹنے کا نظارہ کررہے تھے، چلتے چلتے ٹرین کا آخری حصہ جب اسٹیشن سے نکلنے کے قریب ہوا، تو ٹرین اچانک رک گئی، میں نے اطمینان سے نماز مکمل کی اور پھر ٹرین پر جاکر سوار ہوگیا، فوراً ٹرین چل پڑی۔ ''جان جائے؛ پر آن نہ جائے''۔

حضرت الاستاذ کا یہ عمل ایک خاص کیفیت اور دین کی عظمت کے بے پناہ جذبے پر مبنی تھا؛ اسی لیے آپ نے عزیمت پر عمل کیا اور اللہ تعالیٰ نے فوراً اپنے اس بندے کے جذبات کی قدر کرتے ہوئے اپنے تکوینی نظام کے ذریعے ٹرین کو روک دیا؛ مگر عام لوگوں کو اگر ایسی صورتِ حال پیش آجائے؛ تو حضرت الاستاذ والے عمل کا تجربہ نہ کریں؛ بل کہ رخصت پر عمل کرتے ہوئے جس حال میں ہوں؛ اسی میں سلام پھیر دیں، موقع ملنے پر پھر سے نماز ادا کرلیں، ''زہر پینے کے لیے حضرت

خالد بن ولید رضی اللہ عنہ جیسا یقین بھی چاہیے۔‘‘

سفر میں نماز کا اہتمام کرو

سفر میں نماز کے متعلق نصیحت فرماتے ہوئے ایک مرتبہ آپ نے فرمایا کہ سفر میں نماز کا اہتمام کرنا چاہیے، اس سے دو باتیں ہوتی ہیں: ایک عبادت، دوسرے دعوت۔ آپ کی اس نصیحت پر عمل تو الحمدللہ پہلے بھی تھا، اب بھی ہے، آگے بھی اللہ پاک توفیق دیں؛ مگر سفر میں نماز کے اہتمام کی برکت کا ایک واقعہ ملاحظہ فرمائیں:

آپ کی اس اہم نصیحت پر عمل کا ایک مرتبہ بڑا فائدہ یہ نظر آیا کہ ایک مرتبہ ہم کرائے کی گاڑی سے کسی ضرورت سے پٹنہ گئے، واپسی پر حاجی پور پُل پر ڈرائیور کی کسی بے ضابطگی کی وجہ سے ہماری گاڑی روک دی گئی، کاغذات کی تلاشی لی گئی، کچھ اہم کاغذات بھی نہیں تھے، چناں چہ گاڑی کو ایک طرف کھڑا کرا دیا گیا، ڈرائیور سے کہا گیا کہ ساڑھے بارہ ہزار روپیہ جرمانہ ادا کرو، اس نے کہا کہ فلاں صاحب سے بات کراتا ہوں اور اپنے اس قول کے درمیان ڈرائیور فضول ہنس بھی رہا تھا، گویا پولیس کو اپنی طاقت دکھا رہا تھا، اس کی حرکت سے پولیس کو اور غصہ آ گیا، اس نے کہا کہ ٹھیک ہے، دیکھتا ہوں کون صاحب تجھے بچا لیتے ہیں؟ ہوا بھی یہی کہ کئی گھنٹے گزر گئے، نہ کسی صاحب کا پتہ نہ ان کے فون کا، جب تاخیر زیادہ ہونے لگی، تو میں نے سوچا کہ پتہ نہیں معاملہ کب تک حل ہوگا؛ لہٰذا عصر کا وقت ہو چکا ہے، مجھے عصر پڑھ لینی چاہیے؛ چناں چہ وہیں پُل پر ہی پولس کے خیمے کے قریب میں نے نماز شروع کر دی، نماز اور دعا سے فارغ ہوتے ہی دو تین پولیس والے آ گئے اور انھوں نے کہا کہ ہمارے لیے بھی دعا کریں، میں نے دعا کر دی، اس کے بعد پولیس نے ڈرائیور کو گالی دیتے ہوئے مجھ سے کہا کہ آپ کی وجہ سے اسے چھوڑ رہا ہوں؛ ورنہ ہم دیکھتے کہ اسے کون بچا لیتا ہے؟ اور ہم آپ جیسے لوگوں سے یہ آشا (امید) کرتے ہیں کہ آئندہ اس طرح کی گاڑی میں آپ لوگ سفر نہیں کریں گے، میں نے اولاً اُن کا شکریہ ادا کیا، ثانیاً یہ عرض کیا کہ ہمیں کیا پتہ ان کے کاغذات مکمل

ہیں کہ نہیں، باقی آئندہ ہم معلوم کر کے ہی معاملہ کریں گے، اس واقعے کے بعد حضرت الاستاذ کی نصیحت ''سفر میں نماز کا اہتمام کرنا چاہیے اس سے دو باتیں ہوتی ہیں: ایک عبادت، دوسری دعوت'' بار بار ذہن میں آنے لگی کہ یقیناً یہ سب کچھ نماز ہی کی برکت سے ہوا؛ ورنہ ہم تو اب بھی کچھ نہیں پہلے کیا رہے ہوں گے۔

ٹرین کے سفر میں بھی متعدد مرتبہ یہ بات دیکھنے کو ملی کہ جب ہم نے نماز ادا کی، تو آس پاس بیٹھے ہوئے لوگوں میں اس نماز کے ذریعے اچھا خاموش پیغام پہنچا اور اُنھوں نے پھر بڑی قدر کی۔

یہاں ایک بات ضرور عرض کرنے کی ہے کہ سفر میں بالعموم عام مسلمان تو دور کی بات، طلبہ وعلما بھی نماز میں کوتاہی کرتے ہیں اور اسے وقت سے بے وقت کر دیتے ہیں، عجیب بات ہے کہ ٹرین میں ساری چیزیں بہ آسانی ہو رہی ہوتی ہیں؛ مگر جب نماز کا نمبر آتا ہے، تو سفر کی تمام پریشانیاں حائل ہو جاتی ہیں، حقیقت تو یہ ہے کہ یہ ارادے اور ہمت کی کم زوری ہے؛ ورنہ اگر ارادہ کیا جائے تو عمل کچھ مشکل نہیں!! ''تو ہی نہ چاہے تو بہانے ہزار ہیں''، خیر! اس سلسلے میں بھی حضرت الاستاذ کی اس اہم نصیحت پر کامل توجہ رکھنی چاہیے اور ممکنہ حد تک سفر میں نماز کی ادائیگی کی کامل کوشش کرنی چاہیے۔

ارکانِ نماز کی ادائیگی میں عجلت پر مجھے تنبیہ

جن دنوں آپ کے دل کا آپریشن ہوا تھا، ان دنوں کبھی کبھی بعض نمازیں گھر پر ہی ادا فرمایا کرتے تھے، امامت بالعموم میں یا رفیق محترم مولانا محمد فائز صاحب (استاذ دارالعلوم، آمبور) کراتے تھے (کیوں کہ ان دنوں الحمدللہ ہم دونوں بہ کثرت آپ کے پاس حاضر ہوتے تھے) ایک دن کسی نماز میں، میں نے یہ خیال کر کے کہ آپ کو رکوع سجدے میں تکلیف ہوتی ہے؛ اس لیے ان میں زیادہ وقت نہ لیا جائے ذرا جلدی جلدی نماز پڑھا دی، نماز کے ختم ہوتے ہی ناراضگی کے ساتھ فرمایا کہ اگر اسی طرح نماز پڑھانی ہو، تو نہ پڑھایا کرو، میں مسجد جا کر نماز پڑھ لیا کروں گا، حضرت کی اس تنبیہ پر مجھے خیال ہوا کہ اُوہو! میں نے نماز میں سنت کی رعایت پوری طرح نہیں کی ہے، اس پر

آپ ناراض ہوئے ہیں۔الحمدللہ اس کے بعد میں نے کبھی یہ غلطی نہیں دہرائی۔

ڈاڑھی مونڈے کا نکاح نہیں پڑھاؤں گا

سنت کی عظمت کا اور ایک عجیب نظارہ دیکھئے، ایک مرتبہ ''ختمِ بخاری شریف'' کے موقع پر نکاح خوانی کی ایک پرچی آپ کو دی گئی، آپ نے فرمایا کہ نکاح یہاں نہیں ہوگا؛ بل کہ مسجد میں ہوگا؛ لہٰذا عصر کی نماز میرے محلے کی مسجد میں پڑھو، وہاں نکاح پڑھادیں گے؛ لیکن دولہے کے اہلِ خانہ اصرار کرنے لگے کہ حضرت اسی وقت یہیں پڑھا دیجیے، ان کے جذبات کی قدر کرتے ہوئے آپ رضامند ہوگئے اور دولہے کو اپنے سامنے حاضر ہونے کو کہا، جیسے وہ سامنے آیا اور آپ کی نگاہ اس پر پڑی اور دیکھا کہ اس کی ڈاڑھی نہیں ہے، تو فوراً غصے میں فرمایا کہ اس دارالحدیث میں حضور ﷺ کی حدیث پڑھاتے ہوئے میں اس ڈاڑھی مونڈے کا نکاح پڑھاؤں گا؟ جسے حضور ﷺ کے چہرے سے مناسبت نہیں؛ لہٰذا لے جاؤ اِسے، میں اس کا نکاح نہیں پڑھاؤں گا، یہ کہہ کر آپ تخت سے نیچے اترنے لگے، اُس پر دولہے بے چارے کی پریشانی بہت بڑھ گئی، اسے اپنا ذہنی پروگرام بالکل درہم برہم ہوتا نظر آنے لگا؛ کیوں کہ ظاہر ہے وہ سارا کا سارا نکاح پر ہی موقوف تھا؛ لہٰذا اِس نے ہوش حواس سے کام لیتے ہوئے فوراً کہا کہ حضرت! اَبھی سے ہی پکا وعدہ ہے کہ ڈاڑھی رکھوں گا، دولہے بے چارے کا یہ وار نشانے پر لگ گیا، وعدے کی بنیاد پر آپ نکاح خوانی کے لیے رضامند ہوگئے اور آپ نے نکاح پڑھادیا، اس طرح اس کا ذہنی تعمیر کردہ محل ڈھا جانے سے بچ گیا۔

پانچ ہزار میں تو بکری بھی نہیں آتی

(نکاح سے ہی متعلق ایک اور واقعہ) دینِ اسلام میں نکاح کس قدر آسان ہے اور اُسے کس قدر مشکل بنادیا گیا ہے؟ یہ بتانے اور لکھنے کی ضرورت نہیں، رسم و رواج کی زنجیر میں جکڑ کر اور غیروں کے کلچر سے متأثر ہوکر، آج لوگ نکاح کے پروگرام میں لاکھوں لاکھ روپئے پانی کی طرح بہارہے ہیں، اگر اپنے پاس نہیں ہیں، تو قرض لیتے ہیں؛ مگر فضول خرچی اور اسراف سے باز آنے کو تیار نہیں؛

مگر حیرت ہے کہ جہاں لوگ رسم ورواج کو انجام دینے میں لاکھوں کروڑوں روپئے صرف کررہے ہیں، وہیں مہر دینے کی بات آتی ہے، تو (افسوس کے ساتھ لکھنا پڑ رہا ہے کہ بنگلور جیسے شہروں کا یہ حال ہے) تین ہزار، پانچ ہزار، دس ہزار مقرر کرتے ہیں اور اللہ جانے دیتے بھی ہیں کہ نہیں، چناں چہ اس طرح کا واقعہ یہ پیش آیا کہ ایک دن آپ نے اپنے محلے کی مسجد میں کسی کا نکاح پڑھایا، راقم بھی وہاں موجود تھا، نکاح سے پہلے مہر کے متعلق آپ نے معلوم کیا کہ مہر کتنا ہے؟ تو بتایا گیا کہ پانچ ہزار، اتنا سننا تھا کہ چہرہ مبارک بالکل متغیر ہو گیا، رنگ بدل گیا اور غصے میں فرمایا کہ پانچ ہزار میں تو بکری بھی نہیں آتی، کیا ہماری بچیاں اتنی بے حیثیت ہو گئیں کہ ان کا مہر پانچ ہزار رکھا جا رہا ہے؟! میں نکاح نہیں پڑھاؤں گا، اتنا سننا تھا کہ لڑکے والوں نے معذرت شروع کر دی اور کہا کہ حضرت ہم اور بھی رکھ رہے تھے؛ مگر لڑکی والوں نے ہی کہا تھا کہ زیادہ رکھنے کی کیا ضرورت ہے؟ اس لیے اتنا ہی مقرر کر سکے؛ لہٰذا ہم اس سے دوگنے یا اس سے بھی زیادہ کے لیے تیار ہیں، آپ جیسا فرمائیں اُس پر آپ نے فرمایا کہ ٹھیک ہے، دوگنا (دس ہزار) کر دو؛ لہٰذا جب دوگنا کر دیا گیا، تو آپ نے نکاح پڑھایا۔

ذرا غور فرمائیں! کیا ہمارے معاشرے میں اس لحاظ سے بچیوں پر زیادتی نہیں ہو رہی ہے کہ اُنھیں اتنے معمولی مہر کے عوض حاصل کر لیا جا رہا ہے؛ بل کہ جہاں زیادہ مقرر کیا جاتا ہے، وہاں شوہر پہلی ہی رات میں مہر معاف کرانے کے لیے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو جاتا ہے اور اس بے چاری کو طوعاً یا کرہاً معاف کرنا ہی پڑتا ہے، کیا یہ ظلم نہیں ہے؟!

ٹھہر ٹھہر کر بولو

ایک مرتبہ آپ نے فرمایا کہ جب سے میں نے پڑھا کہ آپ ﷺ لمبا کرتا زیب تن فرماتے تھے، ٹھہر ٹھہر کر بولتے تھے اور حضراتِ شیخین رضی اللہ عنہما سرخ خضاب کیا کرتے تھے، اسی وقت سے میں نے طے کر لیا کہ میں بھی اسی طرح کروں گا؛ چناں چہ نصف ساق تک لمبا کرتا اور ٹھہر ٹھہر کر گفتگو فرمانا، تو آپ نے فوراً شروع فرما دیا اور جب عمر شریف آگے بڑھی بال سفید ہونے لگے، تو پوری زندگی

پابندی سے خضاب کرتے رہے؛ یہاں تک کہ موت کے وقت بھی ڈاڑھی مبارک اور سر کے بال پوری طرح مختضب تھے، ایک ایک سنت پر فریفتگی کے ساتھ عمل کرتے تھے، مجلس میں موجود ہم طلبہ کو مسلسل ٹھہر ٹھہر کر بولنے کی نصیحت فرماتے تھے اور اس طرح ٹھہر ٹھہر کر صاف بولنے کی عادت، آپ کی تمام حقیقی اولاد کو خوب ہے؛ یہ نااہل راقم بھی کوشش کرتا تھا کہ ٹھہر ٹھہر کر صاف بولے؛ اس لیے آپ ایک غیر ملکی طالب علم جو بہت تیز بولتے تھے ان کو سمجھاتے ہوئے کبھی فرماتے کہ ''مرشد کی طرح ٹھہر ٹھہر کر صاف بولو''۔

حضراتِ اساتذۂ کرام کے لیے یہ بات از حد ضروری ہے کہ ٹھہر ٹھہر کر صاف صاف بولیں، بہت سے اساتذہ بڑی تیزی کے ساتھ کلام فرماتے ہیں؛ یہ مناسب نہیں، اسی طرح شروع سے اخیر تک تمام الفاظ کو یکساں طور پر ادا کرنا چاہیے؛ تاکہ دور والے بھی اچھی طرح سن سکیں، یہ نہ ہو کہ ''مبتدا'' تو زور سے ہو؛ مگر خبر اس قدر آہستہ کے بعض ہی سن سکیں اور بعض محروم رہ جائیں، اس سے طلبہ کو بڑا اخلجان رہ جاتا ہے؛ مگر وہ بے چارے ہیبت کی وجہ سے اپنی پریشانی ظاہر نہیں کر پاتے۔

آپ کی ''مسیح العلوم'' آمد اور طلبہ کے استقبال پر ناراضگی

آپ نام وری، شہرت اور تعریف سے جس قدر متوحش تھے، وہ آپ کو جاننے والا تقریباً ہر شخص جانتا ہے، اسی مزاج کے پیشِ نظر اَبھی ۱۴۴۰ھ میں جب آپ ''ختمِ بخاری شریف'' کے موقع پر ''جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم، بنگلور'' تشریف لائے، تو جامعہ میں داخل ہوتے ہوئے جامعہ کے صدر دروازے کے باہر ہی سے، طلبہ دورویہ قطاروں میں کھڑے ہوگئے اور اس طرح سے آپ کا استقبال فرمایا، یہ بات آپ کو اتنی گراں گزری کہ کار سے اُترتے ہی جیسے ہی حضرت اقدس مہتمم صاحب زید مجدہم استقبال کے لیے آگے بڑھے، فوراً آپ نے فرمایا کہ یہ جو عمل ہوا کہ طلبہ کو اس طرح کھڑا کرکے میرا اِستقبال کیا گیا، یہ درست نہیں ہے، اس سے ان کی تحقیر ہوگی اور ہمارے اندر بڑائی پیدا ہوگی، اللہ اکبر! کیسی بے نفسی تھی۔

اور پھر آپ نے اپنے اس قول وعمل کے استناد میں صحابیٔ رسول حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا یہ ارشاد نقل فرمایا: ’’عوام کا عالم کے پیچھے چلنا، عوام کے لیے ذلت ہے اور عالم کے لیے فتنہ‘‘۔

آپ کی تعریف پر مشتمل قصیدہ

’’جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم‘‘ میں اسی ’’ختمِ بخاری شریف‘‘ کے موقع پر جب آپ کی حاضری ہوئی، تو اس موقع سے جامعہ کے شعبۂ افتا سے سندِ فراغت حاصل کرنے والے ایک ہونہار طالبِ علم نے، عربی زبان میں حضرت والا کی شان میں قصیدہ تیار کیا، پروگرام کے نظام میں اس قصیدے کو پڑھانا طے تھا؛ اس لیے جب آپ اسٹیج پر تشریف فرما ہوئے، تو جناب مولانا صغیر احمد صاحب (استاذِ حدیث جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم) نے ایک طالبِ علم کا نام پکارا، جن کو یہ قصیدہ پڑھنا تھا، جیسے ہی یہ وضاحت کی گئی کہ یہ قصیدہ آپ کی شان میں لکھا گیا ہے، فوراً ایک مصرعہ پڑھے بغیر آپ نے فرمایا کہ اسے حذف کر دو، آپ کو اپنی تعریف اپنے سامنے کبھی بھی اچھی نہیں لگتی تھی، جب بھی ایسی نوبت آجاتی، آپ ناراض ہوتے اور بالکل نہیں سنتے۔

ہائے افسوس! اب کیسا دور آگیا کہ جب تک کسی کے سامنے اس کی تعریف نہ کی جائے، وہ سمجھتا ہے کہ یہ میرا مخالف ہے اور جب تعریف کی جاتی ہے، تو باوجودے کہ جس کی تعریف کی جارہی ہے، وہ جانتا ہے کہ میرے اندر یہ چیز نہیں؛ مگر پھر بھی وہ خوش ہوتا ہے اور کچھ لوگ جن کے اندر حقیقی کوئی ٹیلینٹ نہیں ہوتا، وہ اسی خارجی ذریعے سے اپنے کھوٹے سکے کو رواج دینے کی کوشش کرتے ہیں، حدیث شریف میں ہے کہ ’’جب کوئی تمھارے سامنے تمھاری تعریف کرے، تو اس کے منھ میں مٹی جھونک دو (اس کا منھ بند کر دو، تعریف نہ کرنے دو)‘‘۔

یہ کیوں نہیں کہہ دیا کہ آپ.......

اپنی تعریف سننے سے گھبرانے اور اس کو پسند نہ کرنے ہی کا ایک واقعہ یہ بھی آپ ہی سے سنا کہ آپ کسی جگہ پر جلسے میں مدعو تھے، اناؤنسر صاحب نے تعارف کراتے ہوئے (جب کہ آپ کو اس کی

کوئی ضرورت نہیں تھی) آپ کے علمی مقام کو خوب بیان کیا، جو آپ کو بالکل پسند نہیں تھا؛ چناں چہ جب اناؤنسر نے مائک چھوڑ کر اپنی جگہ لی اور آپ کرسی پر تشریف فرما ہوئے، تو خطبۂ مسنونہ کے بعد اپنے نرالے انداز میں فرمایا کہ اناؤنسر صاحب نے میرے تعارف میں ایک بات چھوڑ دی، اتنا کہہ کر غصے میں فرمایا کہ ان کو آگے بڑھ کر یہ بھی کہہ دینا چاہیے تھا کہ ''یہ اللہ میاں کے چھوٹے بھائی ہیں''، اس ارشاد کے بعد اناؤنسر صاحب اور میزبانوں کا اللہ جانے کیا حال ہوا ہوگا؟! پھر آپ نے اپنے مزاج کے مطابق نصیحت فرمائی کہ اس طرح تعریف نہیں کرنی چاہیے، اللہ تعالیٰ کے علم کے سامنے ہم مخلوق کا علم کیا ہے؟ اس کی کیا حیثیت ہے؟ ساری کائنات کا علم اللہ پاک کے علم کے مقابلے میں اتنا بھی نہیں، جتنا پانی چڑیا کے سمندر میں چونچ مارنے کے وقت اس کی چونچ پر لگ جاتا ہے؛ عجیب عالم تھا بے نفسی کا، بس بے نفسی کے الفاظ تو بہت سنے تھے؛ مگر عملی نمونہ تو بس لاکھوں میں کوئی ایک دو ہی ایسا نظر آتا ہے۔

آج میرا سفر ہے

آپ کی تواضع سے ہی متعلق ایک یہ بھی واقعہ پڑھتے چلیے، آج سے چند سال پہلے جب شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب زید مجدہم کا ہندوستان کا دورہ ہوا، اتفاق سے جس دن دیوبند آمد ہوئی، اسی دن حضرت الاستاذ کا کوئی سفر پہلے سے طے تھا، اُدھر حضرت شیخ الاسلام دیوبند پہنچنے کے بعد دارالعلوم تشریف نہیں لائے؛ بل کہ تھکان وغیرہ یا اپنے خونی رشتے داروں سے ملنے کی تڑپ میں پہلے اپنے رشتہ داروں کے دولت کدے پر چلے گئے، دوسرے کسی وقت میں دارالعلوم آنے کا خیال تھا؛ مگر چوں کہ اس وقت تک حضرت الاستاذ کا سفر شروع ہو چکا ہوتا اور حضرت شیخ الاسلام سے ملاقات نہ ہو پاتی؛ اس لیے حضرت الاستاذ، حضرت شیخ الاسلام کے دارالعلوم آنے کا انتظار کیے بغیر پیدل ہی آپ کے قیام گاہ کی طرف چل دیے اور وہیں آپ سے ملاقات فرمائی اور فرمایا کہ آج میرا سفر ہے؛ اس لیے آ گیا کہ شاید ملاقات نہ ہو سکے، اسی ملاقات میں حضرت شیخ

الاسلام نے تواضعاً فرمایا کہ حضرت میں ''تحفۃ الالمعی'' سے فائدہ اٹھاتا ہوں (یہ حضرت الاستاذ کی ''ترمذی شریف'' کی زبردست حلِ کتاب اور پہلی مکمل ترجمے کے ساتھ اردو شرح ہے)، اس پر حضرت الاستاذ نے فرمایا کہ ''الفضل للمتقدم'' (فضیلت تو پہل کرنے والے کے لیے ہے)؛ یہ حضرت الاستاذ نے اشارہ فرمایا حضرت شیخ الاسلام کی ''ترمذی شریف'' کی اردو تقریر بہ نام ''درسِ ترمذی'' کی طرف جو تقریباً پانچ چھ جلدوں میں چھپی ہوئی ہے اور بازار میں دست یاب ہے، جو فقہی اختلافی مسائل کے حل کے سلسلے میں کافی وافی ہے۔

یہ تھے ہمارے بزرگ کس طرح ایک دوسرے کے قائل ہو رہے تھے؟!! اللہ تعالیٰ اب آپ ہم پر حضرت شیخ الاسلام کے سائے کو عافیت کے ساتھ باقی رکھیں!

آپ کے تواضع کی انتہا

تواضع کی حد: عصر کے بعد پابندی سے آپ کی مجلس میں حاضر ہونے والے اور قریب ہو کر بیٹھنے والے طلبہ میں ایک طالبِ علم تھے (وہ راقم سے بھی محبت کرتے تھے؛ جہاں کہیں بھی ہوں، اللہ پاک انھیں خوش رکھے)؛ اس لیے وہ آپ کی نگاہوں میں ہوتے تھے، ایک دن یہ واقعہ پیش آیا کہ کسی گاڑی والے نے ان کے ہاتھ پر ٹکر ماردی، جس سے ہاتھ کی ہڈی ٹوٹ گئی؛ جس کی وجہ سے ان کا مجلس میں آنا بند ہو گیا، ایک دو دن بعد مجھے خیال ہوا کہ بے چارہ حضرت سے محبت رکھتا ہے، پابندی سے حاضر ہوتا ہے، اب نہیں آ رہا ہے اور نہ آنے کی وجہ اس واقعے کا پیش آ جانا ہے؛ لہٰذا حضرت سے ذکر کر کے دعا کی درخواست کر دینی چاہیے؛ چناں چہ میں نے اس طالبِ علم کا پورا واقعہ آپ سے عرض کر دیا، جوں ہی واقعہ سنایا، فوراً آپ نے پوچھا: وہ کہاں رہتا ہے؟ میں نے کہا: حضرت! فلاں جگہ کرائے کا کمرہ لے کر رہتا ہے، تو آپ نے فرمایا کہ اس کی عیادت کو چلنا چاہیے۔

میں نے عرض کیا آپ کے کام کا وقت ہے، آپ نہ جائیں، بس دعا فرما دیجیے صحت کے لیے، اس کے بعد آپ نے ایک رقم میرے حوالے کی اور فرمایا کہ اس طالبِ علم کو دے دینا، یہ رقم ایک

طالبِ علم کی حیثیت سے اچھی خاصی تھی۔

کیا آج کے دور میں ایک معمولی درجے کا استاذ بھی اپنے ایک عام طالبِ علم کے لیے ایسا جذبہ دکھا سکتا ہے؟ مگر دیکھیے یہ تھے دارالعلوم کے شیخ الحدیث وصدر المدرسین، جنھوں نے اس طالبِ علم کے کمرے تک جانے کو خود تیار ہو کر ہم موجود طلبہ کو تھوڑی دیر کے لیے سکتے میں ڈال دیا، یا اللہ! ہمارے اس محسن ومہربانی پر کروڑوں رحمتیں نازل فرما!!

میرے مہتمم صاحب کے متعلق توصیفی کلمات

حضرت اقدس کی پوری زندگی تعلیماتِ نبوی ﷺ کا عملی نمونہ تھی، آپ کی عملی زندگی کے ایک ایک گوشے میں ہم خوشہ چینوں کو یہ چیز آئے دن نمایاں طور پر نظر آتی تھی، یہی وجہ تھی کہ آئے دن ہمارے دلوں میں آپ کی محبتوں میں اضافہ ہوتا چلا گیا، اسی تعلیماتِ نبوی پر عمل کرتے ہوئے نہ آپ کسی کی برائی کرتے تھے اور نہ ہی حد سے زیادہ مبالغہ آمیز کسی کی تعریف کرتے تھے اور نہ ہی اپنے سامنے اپنی تعریف سننا پسند کرتے تھے؛ مگر جہاں حوصلہ افزائی اور حقیقت کی حد تک کسی کی اچھائی سامنے ہوتی، وہاں بخل سے بھی کام نہ لیتے؛ بل کہ کشادہ دلی سے اس کا اظہار فرماتے، اس سلسلے میں ہمارے مہتمم صاحب (حضرت اقدس مولانا ومفتی محمد شعیب اللہ خان صاحب مفتاحی مدظلہٗ) کا نام بہت نمایاں ہے، حضرت مہتمم صاحب کے علمی وروحانی کمالات سے چوں کہ آپ واقف تھے اور جانتے تھے کہ آپ کی ہستی امت کے لیے ایک عظیم سرمایہ ہے؛ اس لیے کئی موقعوں پر آپ نے بہت کھل کر حضرت مہتمم صاحب زید مجدہم کے متعلق بڑے اونچے اونچے توصیفی کلمات کہے، ان میں سے چند ایک کا تذکرہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

مفتی شعیب اللہ صاحب کی شخصیت ''ایک مغتنم شخصیت'' ہے!

۲۰۱۴ء میں جب ''جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم'' میں دورۂ حدیث شریف کا آغاز ہوا، تو اس مبارک موقع پر آپ ''بخاری شریف'' کے افتتاح کے لیے مدعو تھے (یہ سال راقم السطور کے لیے بھی جامعہ

میں پہلا سال تھا)،اس موقع پر آپ نے ''بخاری شریف'' کے سبق کے دوران فرمایا کہ دیکھو! میرا مزاج کسی کی تعریف کرنے کا نہیں ہے؛ مگر میں یہ کہتا ہوں کہ مفتی شعیب اللہ صاحب کی جو شخصیت ہے، وہ ''ایک مغتنم شخصیت'' ہے، اللہ اکبر! اس ایک جملے میں علما، طلبہ اور کرناٹک کی عوام کو کس قدر یہ اشارہ دے دیا کہ یہ ایک عظیم سرمایہ ہے، اس کی خوب قدر کرو۔

اے کاش! ہم حضرت مہتمم صاحب زید فضلہ سے وہ چیز حاصل کرتے، جو انھوں نے اپنے بڑوں سے حاصل کر کے اب تک محفوظ خزانے کی شکل میں جمع کر رکھی ہے اور حقیقی طالب کے منتظر ہیں۔

یہ مہتمم صاحب کو دینا

ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ آپ رحمہ اللہ کا ''حیدرآباد'' کا سفر ہوا، جمعرات، جمعہ کا دن تھا، اس لیے میں نے بہ ذریعہ فون ''حیدرآباد'' حاضری کی اجازت لے لی (جمعرات، جمعہ کی صراحت اس لیے کی کہ اگر تعلیم کے ایام ہوتے، تو آپ مجھے تعلیم چھوڑ کر ''حیدرآباد'' آنے کی اجازت نہ دیتے) دیر رات کو میں وہاں پہنچا، آپ بیدار ہی تھے، پہنچتے ہی معلوم کیا کہ کھانا کھایا؟ ظاہر ہے کہ جواب نفی میں تھا، فوراً مولانا جنید صاحب (استاذ اشرف العلوم، حیدرآباد) کو بلا کر معلوم کیا کہ اس وقت کہیں کھانا مل جائے گا، انھوں نے کہا حضرت آپ فکر نہ کریں، میں انھیں کھانا کھلا دیتا ہوں، کھانے کے بعد دیر رات تک مجھ سے میرے مختلف احوال معلوم کرتے رہے، اگلے دن واپسی سے کچھ پہلے ''ہدایت القرآن'' کی ایک جلد میرے سامنے ایک عالم صاحب کو دی (کسی مصلحت سے نام لینا مناسب نہیں) اور دیتے ہوئے فرمایا کہ یہ تم لو؛ مگر تم پڑھتے کچھ نہیں ہو، یہ فرما کر پھر ان عالم صاحب کو بڑی شفقت سے نصیحت کی کہ کچھ نہ کچھ مطالعے کی بھی عادت ڈالو، پورا وقت اِدھر اُدھر میں صرف نہ کردو۔

پھر آپ نے ایک نسخہ ''ہدایت القرآن'' کی اسی جلد کا میرے حوالے کیا اور فرمایا کہ یہ اپنے مہتمم صاحب کو دینا، ''وہ بندہ پڑھتا ہے''، غالباً یہ جملہ دو مرتبہ ارشاد فرمایا۔

''ختمِ بخاری شریف'' کے لیے ''مسیح العلوم'' آنے کی دعوت

۱۴۴۰ھ کے رجب میں ''ختمِ بخاری شریف'' کے لیے حضرت الاستاذ کو مدعو کرنے کا مشورہ ہوا، اس نا اہل راقم کو کوئی علم نہ تھا اور نہ ہی ہر بات کا علم ہونا ضروری ہے، غالباً مشورے کے بعد حضرت مولانا مفتی فہیم الدین صاحب (استاذ دارالعلوم دیوبند) سے یہ درخواست کی گئی کہ وہ حضرت والا کے پاس حضرت مہتمم صاحب دامت برکاتہم کے نمائندے کی حیثیت سے جائیں اور ''مسیح العلوم'' تشریف لانے کی درخواست پیش کریں؛ چناں چہ وہ جانے لگے اور اپنے ساتھ مفتی محمد نعمان صاحب (مفتی دارالعلوم دیوبند) کو بھی ساتھ لے لیا، ایسا یاد پڑتا ہے کہ حضرت مفتی اشتیاق احمد صاحب (استاذ دارالعلوم دیوبند) کو بھی ساتھ لے لیا (کیوں کہ یہ دونوں آپ کے بالکل بیٹے کی طرح تھے)؛ جب یہ حضرات حضرت اقدس کے گھر کی طرف چلے، تو مشورہ ہوا کہ مرشد بھی بیٹے کی طرح ہے اور آپ اس کا بہت خیال کرتے ہیں؛ لہٰذا اس سے بھی کہا جائے کہ تم ''مسیح العلوم'' سے حضرت کو فون کرو (اب جب مجھے معلوم ہوا کہ آپ یہاں مدعو کیے جارہے ہیں، تو خوشی کی انتہا نہ رہی)؛ چناں چہ مفتی فہیم الدین صاحب کا مجھے فون آیا اور میں نے تعمیلِ حکم میں حضرت الاستاذ کو فون کردیا اور درخواست پیش کردی، آپ نے پیروں کی تکلیف کی وجہ سے پہلے تو فرمایا کہ اب میں سفر کے قابل کہاں رہا؟ اس کے بعد مقامِ ناز میں ہونے کی وجہ سے میں نے کہہ دیا کہ میرے لیے آجائیے! مجھے کتنے دن ہوگئے زیارت کیے ہوئے! اس پر آپ نے فرمایا کہ تمھارے لیے نہیں؛ بل کہ تمھارے مہتمم صاحب کے لیے آؤں گا، ''وہ علم والے ہیں، ان کی زیارت کو جی چاہتا ہے''۔ اللہ اکبر! کتنی بڑی بات ارشاد فرمائی۔

''صدیق'' کی مثال ہیں

اسی سال ۱۴۴۱ھ کے رمضان المبارک میں حضرت مہتمم صاحب دامت برکاتہم نے اولاً: ثریا ستارے والی حدیث شریف کی تشریح بعض بڑے علما کی تحریر کو سامنے رکھ کر کی، جس کا حاصل یہ تھا کہ

کسی درجے میں امید کی جاسکتی ہے کہ ۱۲ر مئی کے بعد ''کورونا وائرس'' نامی وبا ختم ہوجائے، حضرت مہتمم صاحب زید مجدہم کی تحریر کا خلاصہ اس سے زیادہ کچھ نہیں تھا؛ مگر بہ ہر حال اس حدیث شریف کا مطلب جمہور علما نے وہ نہیں بیان کیا تھا؛ بل کہ یہ حدیث شریف ایک خاص پسِ منظر میں تھی اور اس کا تعلق خاص طور پر کھجور کے پھل کو لگنے والی بیماری سے تھا، عام بیماری سے نہیں تھا۔

جب حضرت الاستاذ کو اس بات کا علم ہوا کہ بعض بڑے علما کی تحریر کی بنیاد پر حضرت مفتی محمد شعیب اللہ خان صاحب نے ثریا ستارے والی حدیث کو عام بیماری اور وبا سے متعلق قرار دیا ہے، تو فوراً آپ نے اپنے خاص وصف: صاف گوئی اور حق گوئی کے پیشِ نظر فرمایا کہ ''حضرت مفتی شعیب اللہ خان صاحب جید الاستعداد اور بڑے عالم ہیں ؛مگر ان کی یہ بات درست نہیں''، اس حدیث شریف کا ظاہر عام اور باطن خاص ہے اور پھر اپنے مخصوص انداز میں مثالوں اور پسِ منظر کو ذکر کر کے مذکورہ حدیث شریف کی اتنی واضح اور صاف اور مضبوط تشریح فرمائی کہ بات بالکل واضح ہوگئی کہ اس حدیث شریف کا تعلق عام بیماریوں سے نہیں؛ بل کہ خاص کھجور کے پھل کو لگنے والی بیماری سے ہے۔

حضرت مہتمم صاحب زید مجدہم کو جب حضرت والا کی اس تشریح کا علم ہوا، تو فوراً آپ نے مزید گہرائی سے حضراتِ محدثین کی اس حدیث کے حوالے سے لکھی گئی تشریح کو دیکھا اور آپ پھر مکمل شرحِ صدر کے ساتھ اس نتیجے پر پہنچ گئے کہ واقعی حضرت مفتی صاحب نے جو کچھ فرمایا، وہی جمہور کی رائے ہے؛ لہٰذا فوراً حضرت مہتمم صاحب (زیدت معالیہ) نے مکمل صراحت کے ساتھ نہایت عمدہ انداز میں اپنے سابق قول سے رجوع کا اعلان فرما کر جمہور کی رائے کو اختیار کرنے کا اعلان فرمادیا اور حضرت الاستاذ حضرت مفتی صاحب کا شکریہ بھی ادا کیا، جب آپ کا یہ رجوع والا بیان ''واٹس ایپ'' کی گردشوں میں آگیا، تو کسی قریبی نے حضرت والا کو بھی بتایا اور سنایا، آپ نے حضرت مہتمم صاحب کے رجوع والے اس بیان کو سنا، سننے کے بعد اسی دن تراویح کے بعد اپنے تفسیری بیان میں ''صدیق'' کی وضاحت فرماتے ہوئے فرمایا کہ ''صدیق'' کہتے ہیں اس کو ''جو حق بات کو فوراً تسلیم کرلے'' اور اس کی مثال میں پہلے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا واقعہ بیان کیا (سفر معراج کی تصدیق

والا)؛ جس کی وجہ سے آپ کا لقب ''صدیق'' پڑا، دوسری مثال میں فرمایا کہ جیسے مفتی شعیب اللہ خان صاحب ہیں، جیسے ہی انھیں ثریا ستارے والی حدیث شریف سے متعلق حق بات کا علم ہوا، فوراً اُنھوں نے مان لیا اور اپنے پہلے ضعیف قول سے رجوع کرلیا، یہ ''صدیق'' کی مثال ہے، سبحان اللہ! اتنے بڑے انسان کی طرف سے ایسا اعزاز اور اتنی بڑی توثیق! سچ ہے:

یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا
ہر مدعی کے لیے دار و رسن کہاں!

(طلبہ کی اصلاح) غیبت پر ایک طالبِ علم کو تنبیہ

ایک مرتبہ حضرت والا کی مجلس میں ایک بڑے عالمِ دین کا کچھ نامناسب تذکرہ ایک مہمان طالبِ علم کرنے لگے؛ مگر اب تک نام نہیں لیا تھا، حضرت الاستاذ کے چہرے کا رنگ پھر بھی بدل رہا تھا؛ کیوں کہ اشارے صاف تھے، ہم جیسے بھی سمجھ رہے تھے کہ یہ کس شخصیت کا تذکرہ کررہا ہے؛ مگر آپ ابھی تک اس کے مہمان ہونے کی وجہ سے اور صراحت نہ ہونے کی وجہ سے خاموش تھے، اس خاموشی سے وہ دھوکہ کھا گئے اور وہ سمجھنے لگے کہ میں صحیح بات عرض کررہا ہوں؛ چناں چہ آگے بڑھ کر اس نے نام لے لیا؛ بس پھر کیا تھا، اتنا ہوا کہ فوراً آپ نے اس کی غلط فہمی دور کردی اور فرمایا کہ اب تم نے غیبت شروع کردی خاموش ہوجاؤ، وہ طالبِ علم اپنے جیسا منھ لے کر رہ گیا اور پھر ایسی بات نہیں کی۔

عصر بعد کی مجلس میں سر جھکا کر بیٹھنے والا ایک طالبِ علم

ایک دن عصر بعد کی مجلس میں ایک نیا طالبِ علم حاضر ہوا، تمام طلبہ کے ساتھ وہ بھی بیٹھ گیا، ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ پوری محبت وعظمت کے ساتھ حضرت والا کی طرف متوجہ رہتے کہ آپ کیا فرماتے ہیں؛ مگر وہ بے چارہ ذرا سادہ قسم کا تھا، بالکل سر جھکا کر مراقبے کے انداز پر بیٹھ گیا، کچھ ارشاد فرماتے ہوئے آپ کی نگاہ اس طالبِ علم پر پڑگئی دیکھا کہ وہ بالکل سر جھکائے ہوئے بیٹھا ہے، اس پر آپ نے ہلکی سی ناراضگی سے فرمایا کہ اس سر جھکا کر بیٹھے ہوئے طالب علم کو مسجد پہنچادو، وہاں مراقبہ کرلے گا، یہ

مراقبے کی جگہ نہیں، اس طرح آپ نے اصلاح فرمادی کہ مجلس میں اس وقت کیسے بیٹھنا چاہیے تھا؟

سلام کا جواب اہتمام سے نہ دینے پر ہم طلبہ کو تنبیہ

آپ دیوبند میں جس محلے میں قیام پذیر تھے، اس محلے کا ہر ہر فرد آپ کا بے پناہ احترام کرتا تھا، خواہ وہ بوڑھا ہو یا نوجوان؛ بچہ ہو یا بچی؛ حضرت والا جب نماز کے لیے گھر سے نکلتے، تو اس وقت بالعموم ہم تین چار طلبہ آپ کے ساتھ ہوتے (عام طور پر عصر مغرب کی نماز میں) جیسے ہی آپ اپنے صدر دروازے سے باہر آتے راستے پر موجود ہر چھوٹا بڑا؛ بل کہ ڈھائی ڈھائی تین تین سال کے بچے تک آپ کو سلام کرتے اور آپ چھوٹے بڑے ہر ایک کا جواب دیتے ہوئے مسجد تشریف لے جاتے، ہم ساتھ میں موجود طلبہ رعب و دبدبے کی وجہ سے یا تو جواب نہ دیتے، یا بہت آہستہ دیتے جو آپ سن نہ پاتے، جب ہماری یہی عادت ہوگئی، تو ایک دن آپ نے راستے ہی میں رک کر ذرا غصے میں فرمایا کہ سلام کرنے والے کا جواب صرف مجھ پر واجب ہے؟ تم لوگ سب کے سب میرے ساتھ ہوتے ہو؛ مگر سلام کا جواب نہیں دیتے، لوگ کیا سمجھیں گے جب کہ تم لوگ طالبِ علم ہو؛ اس دن سے پھر ہم نے زور سے جواب دینے کا اہتمام کیا۔ **فجزاہ اللہ تعالیٰ عني خیر الجزاء**

دعا کیے بغیر اٹھنے پر تنبیہ

حضرت اقدس کی تربیت کا انداز بالکل نرالا تھا، آپ قریبی طلبہ پر خصوصی نگاہ رکھتے اور کمی کوتاہی پر ضرور اصلاح فرمادیتے۔

ہم ساتھ میں موجود طلبہ کا طریقہ یہ تھا کہ نماز کے بعد جب آپ مسجد سے گھر واپس ہوتے، تو ہم طلبہ خواہ ہماری تسبیح مکمل ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو؛ دعا وغیرہ اہتمام سے مانگ لی ہو یا نہ مانگی ہو؛ بس جب آپ مسجد سے نکلتے تو ہم بھی نکل آتے، غالباً آپ کو اس کا احساس ہوگیا؛ چناں چہ ایک دن ایسا لگا کہ بالقصد آپ سلام پھیرنے کے معاً بعد اٹھ کر مسجد سے باہر آنے لگے، حسبِ معمول مسجد میں موجود طلبہ بھی فوراً بغیر تسبیح و دعا وغیرہ مکمل کیے ساتھ ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے، دو چار قدم چلنے پر جب آپ کو

احساس ہوگیا کہ طلبہ بھی میرے ساتھ تسبیح وغیرہ پڑھے بغیر آنے لگ گئے ہیں، تو فوراً آپ مسجد میں ہی رک گئے اور اِن طلبہ کی اچھی طرح خبر لی اور فرمایا کہ تم لوگوں نے تسبیح مکمل کرلی؟ جو میرے پیچھے پیچھے آنے لگ گئے؟ جاؤ! سب بیٹھ کر تسبیح مکمل کرو۔ (اتفاق سے راقم کی کچھ رکعات اس دن چھوٹ گئی تھیں، جسے مکمل کرنے میں لگے رہنے کی وجہ سے یہ ان طلبہ کے ساتھ نہیں تھا۔)

میری ایک غفلت پر تنبیہ

آپ کی ایک عادتِ شریفہ یہ تھی کہ آپ ہم طلبہ سے جسمانی خدمت تقریباً نہیں لیتے تھے، بہت زیادہ تو سر پر تیل رکھنے کی اجازت دے دیتے، ادھر آٹھ دس سالوں سے پیروں میں بہت تکلیف رہتی تھی، تو ہم قریبی طلبہ کو کچھ دعائیں آپ نے یاد کرادی تھیں، جسے پڑھ کر ہم آپ کے قدم مبارک پر آہستہ آہستہ ہاتھ پھیرتے ہوئے دم کرتے تھے، ایک دن مجھ سے غفلت یہ ہوئی کہ دعا پڑھتے پڑھتے میں آپ سے کچھ پوچھنے لگ گیا، جس سے دعا پڑھنے کا سلسلہ ظاہر ہے منقطع ہوگیا؛ پھر بھی غفلت میں میں دم کرنے لگا آپ نے ہلکی سی ناراضگی سے فرمایا کہ دیکھو باتیں بھی کررہا ہے اور دم بھی کررہا ہے، اب جاکر مجھے ہوش آیا کہ میں یہ کیا کررہا ہوں، یہ تھی آپ کی ہم پر ہمہ وقت توجہ فوراً آپ غلطی کی اصلاح فرمادیتے تھے۔

کوئی نئی بات نہیں بتارہے

طلبہ کی ایک کمزوری یہ ہوتی ہے کہ وہ ابھی اپنی نادانی کی وجہ سے یہ نہیں سمجھ پاتے کہ بڑوں کے سامنے کتنا بولنا ہے؟ اسی طرح ایک کم زوری یہ ہوتی ہے کہ کبھی کچھ مطالعہ وغیرہ اگر کرلیا، تو اسے ظاہر کرنے کا موقع بڑی شدت سے ڈھونڈتے ہیں اور جب تک ظاہر نہ کردیں، اس وقت تک ایک طرح کی بے چینی میں رہتے ہیں، خیر اسی طرح کا ایک موقع پیش آیا کہ حضرت والا جس وقت ''بخاری شریف'' کی ''کتاب التفسیر'' کی شرح مکمل کررہے تھے، اس دوران کسی آیت سے متعلق ہم حاضر رہنے والے طلبہ کے سامنے کچھ ارشاد فرمایا، اس پر ایک طالبِ علم نے جلدی جلدی دو تین اردو

تفسیر کا حوالہ دیا کہ حضرت اس آیت سے متعلق فلاں تفسیر میں یہ لکھا ہے اور فلاں تفسیر میں یہ لکھا ہے، اس انداز سے کہ گویا وہ بہت مطالعہ رکھتا ہے، جب وہ بولنے ہی لگا، تو آپ نے بڑے ہی اطمینان سے فرمایا کہ ''کوئی نئی بات نہیں بتا رہے، یہ سب دیکھا ہوا ہے''، اب جا کر اسے تنبہ ہوا کہ میں کیا کر رہا ہوں، اس طرح آپ نے نہایت نرالے انداز میں تنبیہ فرمادی کہ اپنے بڑوں کے سامنے اپنا مطالعہ نہیں جھاڑنا چاہیے، ذرا کم ہی بولنا چاہیے۔

اَبھی تو منھ سے دودھ کی بو آ رہی ہے

میرے دورۂ حدیث شریف کے سال ایک دن یہ بات پیش آئی کہ میرے ایک ذی استعداد ساتھی اور میں؛ دونوں حضرت اقدس کا پیر بس یوں ہی دبا رہے تھے، اسی دوران آپ نے مستورات کی جماعت سے متعلق فرمایا کہ مستورات کو تبلیغ کا کام بس اپنے محلے کی حد تک کرنا چاہیے، اس سے آگے بڑھ کر تبلیغ کے لیے عورتوں کا ملک یا بیرونِ ملک کا سفر کرنا درست نہیں، حضرت والا کے اس ارشاد کو سننے کے بعد میرے اس ساتھی نے فوراً کہا کہ حضرت تجربے سے عورتوں کا جماعت میں نکلنا مفید ثابت ہوا ہے، (یہ بات انھوں نے اس لیے کہی کہ دارالعلوم دیوبند میں چند طلبہ، جو تبلیغ کے کام میں حد سے زیادہ غلو کرنے والے تھے، ان میں سے ایک یہ بھی تھے، اس لیے انھیں حضرت کی اتنی قیمتی بات بھی ہضم نہ ہوئی) اتنا کہنا ہی تھا کہ کہ آپ کے چہرے کا رنگ بالکل متغیر ہو گیا اور آپ نے فرمایا کہ ''ابھی تو تمھارے منھ سے دودھ کی بو آ رہی ہے اور تجربے کی بات کر رہے ہو''، اس پر وہ خاموش ہو گئے۔

ہائے رے غلو! تو کس قدر خطرناک ہے کہ ایک چھوٹی سی عمر کا ادنیٰ سا طالبِ علم اپنے اس عظیم اور جہاں دیدہ استاذ کی بات کو تسلیم نہ کر کے، ان کے سامنے تجربے کی بات کر رہا ہے، خدایا ہمیں ایسے غلو سے ہمیشہ محفوظ رکھئے، آمین۔

تیرے اس ''مطلب'' کا کیا مطلب؟

حضرت اقدس کی ایک خاص بات یہ تھی کہ آپ ہمیشہ اس بات پر ہمیں توجہ دلاتے تھے کہ بات

چیت میں کسی خاص لفظ کے بولنے کی عادت نہ ڈالو، جیسے بعض مرتبہ اس طرح کے الفاظ کی عادت ہو جاتی ہے: ''چناں چہ''اسی طرح ''مطلب یہ ہے کہ''، ''کہ ہاں'' وغیرہ، تو اسی سلسلے کا ایک دن مجلس میں یہ واقعہ پیش آیا کہ میرے ایک ساتھی نے حضرت سے کچھ پوچھنا چاہا، تو غالبًا مارے رعب کے اس نے اپنی گفتگو کا آغاز اس طرح کیا کہ ''حضرت! مطلب یہ ہے کہ'' جب کہ ابھی اُنھوں نے اپنے اس لفظ ''مطلب یہ ہے کہ'' سے پہلے کچھ بھی نہیں کہا تھا، یہیں سے گفتگو کا آغاز فرمایا تھا، اس پر حضرت نے ذرا ظریفانہ انداز میں فرمایا کہ تیرے اس ''مطلب'' کا کیا مطلب؟ اُنھیں اس پر تنبہ ہوا اور ذرا شرمندہ ہو گئے، اس پر پھر آپ نے بڑی محبت سے فرمایا کہ بلا وجہ کسی لفظ کے بولنے کی عادت نہیں ڈالنی چاہیے۔

لہٰذا جن لوگوں کو بلا وجہ کسی لفظ کے بولنے کی عادت ہے، انھیں توجہ رکھ کر اُسے ختم کرنے کی کوشش کرنی چاہیے، راقم نے بعض لوگوں کے متعلق سنا کہ وہ ایک ایک سلسلۂ کلام میں تیس تیس، چالیس چالیس مرتبہ ''کہ ہاں''، ''اسی طریقے سے''، وغیرہ جیسے الفاظ استعمال کرتے ہیں، اس پر توجہ کی ضرورت ہے۔

اردو زبان پر آپ کی محنت

عربی زبان کے بعد ہمارا سب سے بڑا علمی سرمایہ اس وقت بلا مبالغہ ''اردو زبان'' میں ہے، اس لیے اس سرمایے سے صحیح طور پر ہمیں فائدہ اُٹھانے کے لیے زبان کو سیکھنا اور اس میں ایک حد تک مہارت حاصل کرنا ضروری ہے، یہ بات طالبِ علمی کے ہی زمانے سے آپ کے دل و دماغ میں خوب اچھی طرح رچ بس گئی تھی، چناں چہ اس حوالے سے بھی راقم نے آپ کو ایک سے زائد مرتبہ یہ فرماتے ہوئے سنا کہ ''چوں کہ میری مادری زبان گجراتی تھی؛ اس لیے میں نے اردو سیکھنے کے لیے بڑی محنت کی ہے، طالب علمی کے زمانہ میں اردو زبان ہی سیکھنے کے لیے میں کبھی بھی گجراتی طلبہ کے ساتھ نہیں رہتا تھا؛ کیوں کہ وہ سب آپس میں جب ملتے جلتے تھے، تو گجراتی ہی زبان میں بات

کرتے تھے اور ان کی اردو اخیر تک ٹھیک نہیں ہوتی تھی اور مجھے اردو سیکھنی تھی؛ اس لیے میں ان سے دور ہی رہتا تھا''، آپ اپنے اس موقف پر اخیر عمر تک قائم رہے۔

راقم نے الحمد للہ ایک اچھا خاصا وقت آپ کی مقدس خدمت میں گزارا؛ مگر کبھی بھی اپنی اولاد یا گجرات سے آنے والے مہمان یا گجراتی طلبہ سے گجراتی زبان میں آپ کو بات کرتے دیکھا نہ سنا، ہاں! جب کبھی اپنے کسی بڑے سے، جو گجرات میں ہوں اگر بات کرتے؛ تو ان کی رعایت میں تھوڑی بہت کر لیتے۔

الحمد للہ! اللہ پاک کی سنت ہے کہ وہ کوشش کرنے والے کی کوشش کو ضائع نہیں فرماتے، اللہ پاک نے اس سلسلے میں بھی آپ کو کس قدر نوازا، اسے بالکل ہی لکھنے کی ضرورت نہیں، ''مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید''؛ آپ کی جملہ تصانیف وتقاریر اس کی شہادت دے رہی ہیں کہ اللہ پاک نے اردو زبان میں کس حد تک مختلف پہلوؤں سے آپ کو کمال عطا فرما دیا تھا؛ البتہ راقم یہ بات پورے شرحِ صدر کے ساتھ ذکر کرنا ضروری محسوس کرتا ہے کہ آپ اردو زبان میں صرف زبان کی حد تک نہیں تھے؛ بل کہ زبان سے آگے بڑھ کر اَدب تک کامل رسائی حاصل کیے ہوئے تھے، چناں چہ اس کے مشاہدے کے لیے ''ہدایت القرآن'' کی وہ جلدیں کافی ہوں گی، جو آپ نے تحفۃ القاری کی تکمیل کے بعد تحریر فرمائی ہیں، راقم کو دو سال سے ''جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم، بنگلور'' میں ﴿سُورَةِ الأَنعَامِ﴾ سے ﴿سُورَةِ الحَجِّ﴾ تک ''ترجمۂ قرآن'' پڑھانے کی سعادت نصیب ہے، اس سال ترجمہ پڑھاتے ہوئے ''تفسیرِ مظہری'' اور ''بیان القرآن'' کے ساتھ ساتھ خصوصیت سے ﴿سُورَةِ الأَنعَامِ﴾ سے ﴿سُورَةِ الحَجِّ﴾ تک تقریباً بالاستیعاب ''ہدایت القرآن'' دیکھنے کی سعادت نصیب ہوئی، حضرت الاستاذ نے تفسیری ترجمے اور تشریح میں جو زبان استعمال کی ہے اور اردو زبان کے جگہ جگہ جو محاورے استعمال کیے ہیں، اسے پڑھ کر تو طبیعت عش عش کرتی ہے: الفاظ، تعبیرات، اور محاورے (جو دریا بہ کوزہ ہوا کرتے ہیں) جو بر وقت استعمال کیے گئے ہیں، ان کا ایسا عجیب وغریب حسین سنگم ہے، جو حیرت میں ڈالے ہوئے ہے، قاری بالکل سر دھننے لگ جاتا ہے کہ آخر اتنے اور

ایسے محاورے اور تعبیرات آپ نے کہاں سے اس میں سُمو دی ہیں!

بنگالی طلبہ کو نصیحت

آپ کو بار ہا ایسا دیکھا گیا کہ بنگالی طلبہ جب حاضرِ مجلس ہوتے اور کچھ بولنا پوچھنا چاہتے اور زبان پر قدرت نہ ہونے کی وجہ سے اپنی بات صحیح طور پر نہیں کہہ پاتے؛ بل کہ بے چارے بے موقع الفِ مدہ، واوِ مدہ، اسی طرح کسی مجہول کو معروف یا اس کے برعکس کر دیتے اور یہ چیز ہم طلبہ کے لیے سامانِ تفریح ہو جاتی، تو ایسے موقع پر آپ ان کو نصیحت فرماتے کہ اردو زبان پر محنت کرو اور ساتھ ہی یہ بھی فرماتے کہ آپس میں بھی اردو ہی بولو، نہیں ہوتا ہے، تو سب الگ الگ رہو، اردو بولنے کی عادت ڈالو، تب جا کر زبان ٹھیک ہوگی؛ مگر کیا کہا جائے ان بے چاروں کی اپنی زبان سے بے پناہ محبت کو، کہ وہ اسے کسی بھی صورت میں چھوڑنے کو تیار نہ ہوتے، آپ کی مجلس سے اٹھنے کے بعد پھر وہی ''کُتھا جاچّے'' شروع کر دیتے، یہی وجہ ہے کہ وہ دس دس سال بھی دارالعلوم میں رہنے کے بعد اردو پر قابو نہیں پاتے تھے۔

ایک لطیفہ

ایک مرتبہ آپ کا ''بنگلہ دیش'' کا سفر ہوا، خصوصی مجلس میں یا عام بیان میں آپ نے کوئی لطیفہ سنایا (جیسا کہ سامعین کو تر و تازہ رکھنے کے لیے آپ خصوصیت سے ایسا کرتے تھے) لطیفہ سننے کے بعد بھی تمام لوگوں کے چہرے بالکل اسی طرح سنجیدہ، فکرِ آخرت میں ڈوبے رہے، جیسے لطیفہ سنانے سے پہلے تھے؛ کیوں کہ کسی کو تو لطیفہ سمجھ میں آیا نہیں، تو ہنستے کیا؟ جب کہ حضرت الاستاذ کے لطیفے اور اسے بولنے کا انداز، ایسا زبردست ہوتا تھا کہ صوفی سے صوفی طالبِ علم کا بھی ضبط کا بندھن ٹوٹ جاتا تھا اور مسکراہٹ ان کے بھی چہرے پر بکھر جاتی تھی، ظاہر ہے کہ ایسا لطیفہ سننے کے بعد بھی، جب کسی کو ہنسی نہیں آئے گی؛ تو لطیفہ سنانے والے کو تو برا لگے گا ہی، چناں چہ آپ نے دیوبند واپسی پر افسوس کے ساتھ یہ واقعہ ہمیں سنایا؛ پھر مزاحاً فرمایا کہ جب بھی ''بنگلہ دیش'' جاتا ہوں، تو واپسی پر وہیں،

ایئر پورٹ پر قسم کھالیتا ہوں کہ اب دوبارہ نہیں آؤں گا؛ کیوں کہ یہ کچھ سمجھتے ہی نہیں، خواہ مخواہ میرا وقت ضائع ہوتا ہے اور ان کا پیسا؛ مگر کیا کروں ان کی محبت میں پھر جاتا ہوں۔

ایک اور لطیفہ

بنگلہ دیشیوں کے اردو زبان نہ سمجھنے کا ایک اور لطیفہ آپ نے ایک مرتبہ سنایا کہ ''بنگلہ دیش'' کے سفر میں ایک مرتبہ رات میں لیٹتے وقت چند طلبہ پیر دبا رہے تھے، تھوڑی دیر بعد میں نے کہا کہ بتی بند کردو؛ مگر ان طلبہ پر اس بات کا کوئی اثر نہیں ہوا، پھر تھوڑی دیر بعد میں نے کہا کہ بتی بند کردو، اس مرتبہ بھی اُن پر کوئی اثر نہیں ہوا، وہ اپنی جگہ پر بیٹھے ہوئے پیر دباتے رہے، اتنے میں کوئی استاذ بھی جو دارالعلوم کے پڑھے ہوئے تھے؛ وہ آگئے، پھر تیسری مرتبہ آپ نے فرمایا کہ بتی بند کردو، اب بھی ان کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی، ان میں سے ایک بھی ٹس سے مس نہ ہوا، کوئی ایک بھی بتی بند کرنے کے لیے نہیں اٹھا، اب آپ نے ذرا غصے میں فرمایا کہ بار بار کہہ رہا ہوں کہ بتی بند کردو، بتی بند کردو؛ مگر تم لوگ سن ہی نہیں رہے، یہ کہنے پر فوراً اس آئے ہوئے استاذ نے اپنے مخصوص بنگالی لہجے میں کہا کہ: بُوتّی بُوْنْدْ کُوْرْ دُو، (حرف ''ب'' کو مجہول پڑھیں اور قدرے کھینچ کر ''ت'' سے ملادیں، اسی طرح دوسری ''ب'' اور ''ک'' کو بھی مجہول اور ذرا کھینچ کر پڑھیں، بتائے ہوئے طریقے کے مطابق دوبارہ اب پھر پڑھیں، لطیفے کا لطف آئے گا) تب طلبہ کو سمجھ میں آیا اور اُنھوں نے بتی بند کی۔

آپ ہمیشہ بڑے درد کے ساتھ فرماتے تھے کہ پاکستان کی عداوت میں انھوں نے اردو زبان سے دوری اختیار کرلی ہے، جس کی وجہ سے یہ بڑے علمی سرمایے سے محروم ہورہے ہیں؛ اللہ کرے کہ حضرت الاستاذ کے درد کو اب بھی یہ سمجھ جائیں۔

استاذ سے صرف ایسے سوال کیا کرو......

طلبہ کی جماعت میں مختلف مزاج وطبیعت کے طلبہ ہوتے ہیں، اساتذہ سے وہ جو سوال کرتے ہیں، اس میں بھی ان کی اغراض مختلف ہوتی ہیں، طلبہ کو اپنے اساتذہ سے کیا اور کب پوچھنا چاہیے؟

اس کے متعلق ایک سے زائد مرتبہ راقم نے آپ سے یہ نصیحت سنی کہ طلبہ جس بات کو خود حل کر سکتے ہیں، اس کا سوال استاذ سے نہیں کرنا چاہیے، اگر کوئی عبارت سمجھ میں نہیں آ رہی ہے یا کوئی اعتراض اس عبارت پر ہو رہا ہے، تو پہلے خود اُسے حل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے؛ اگر کوشش کے باوجود بھی حل نہ ہو پائے، تو پھر اساتذہ سے رجوع کرنا چاہیے۔

کوئی سوال ذہن میں کود پڑے، تو پوچھنا چاہیے، سوچ سوچ کر سوال نہیں کرنا چاہیے

بعض طلبہ جب کسی استاذ کے پاس استفادے کے لیے جاتے ہیں، تو اب مجلس میں جا کر سوچ سوچ کر ذہن میں سوالات لاتے اور پوچھتے ہیں، آپ نے ایک مرتبہ اس پر تنبیہ فرماتے ہوئے فرمایا کہ اس طرح سوچ سوچ کر سوال پیدا نہیں کرنا چاہیے؛ ورنہ انسان کا ذہن اس سے خبطی ہو جائے گا، ہاں جو سوال ذہن میں بالکل کود پڑے بغیر سوچے، وہ پوچھنا چاہیے۔

تبلیغی جماعت کی حوصلہ افزائی

حضرت الاستاذ کا ایک خاص وصف تھا (جس کو تقریباً ہر کوئی جانتا ہے) حق بات کو بالکل صاف اور واضح انداز میں بیان کر دینا، اس کا تعلق خواہ کسی فرد سے ہو یا جماعت سے؛ چناں چہ آپ اپنے اسی خاص وصف کی بنا پر سبق میں بہت سی مرتبہ تبلیغی جماعت میں در آنے والی خطرناک قسم کی بیماریوں کی طرف اشارہ فرما کر اس کو ختم کرنے کا مشورہ دیتے؛ مگر ناس ہو غلو اور انتہا پسندی کا کہ دوسرے تو دوسرے، آپ کے درس سے دن رات مستفید ہونے والے آپ کے شاگرد ہی جو تبلیغی جماعت کے سلسلے میں خطرناک حد تک غلو کا شکار ہو چکے تھے اور جنھیں افراط کا ''کورونا وائرس'' ہر طرف سے آ لگا تھا، وہ ہمیشہ آپ کے خلاف باتیں کرتے تھے اور یہ کہتے تھے کہ آپ (العیاذ باللہ) تبلیغی جماعت سے ذہنی موافقت نہیں رکھتے ہیں، جب کہ یہ بات سو فی صد غلط تھی اور ایسی بات کہنے کی وجہ؛ صرف اور صرف یہ تھی کہ انھیں سبق کے علاوہ حضرت الاستاذ کی مجلس کی دار العلوم کے چار پانچ سالہ طالبِ علمی کے دور میں ہَوا بھی نہیں لگتی تھی، ان کی محرومی قسمت یہ تھی کہ وہ اپنے عصر بعد کے

وقت کو غیر ضروری مشغلے میں تو ضائع کر دیتے تھے؛ مگر کسی ایک دن بھی اس عظیم انسان کی مجلس کی حاضری انھیں نصیب نہیں ہوتی تھی؛ بل کہ حقیقت یہ ہے کہ بالعموم تبلیغ میں غلو کیے ہوئے طلبہ کی نگاہ میں اساتذہ کی کوئی قدر ہی نہ تھی؛ اسی لیے بعض غالی کو تو راقم نے بہ راہِ راست سنا کہ ہم اپنے تعلیمی مشورے کے لیے بھی ''نظام الدین'' جاتے ہیں، کس قدر افسوس کی بات ہے کہ رات دن ہمارے لیے مر کوئی اور رہا ہے اور مشورہ کہیں اور جا کر ہو رہا ہے!!

یہ باتیں بہ راہِ راست مشاہدے کی بنیاد پر لکھی جا رہی ہیں اور بہت کچھ ان کے غلو کے قبیل کی چیزیں ہیں؛ مگر کیا تذکرہ کیا جائے۔ خیر! وہ آپ کی مجلس میں حاضری کی سعادت سے محروم رہنے کی بنا پر آپ کی شخصیت سے تقریباً ناواقف تھے، (ظاہر ہے کہ صرف سبق کی حد تک کسی کی شخصیت کو کیسے پہچانا جا سکتا ہے) اور آپ کے متعلق بدگمانی میں مبتلا تھے، شاید اب بھی ہوں؛ مگر حقیقت یہ ہے کہ آپ تبلیغی جماعت اور اس کے کام سے بہت محبت کرتے تھے، جو بھی جماعت آپ کے پاس عصر بعد ملاقات کے لیے آتی، اس کی حوصلہ افزائی فرماتے اور دعا دیتے ہوئے فرماتے کہ اللہ تعالیٰ تمھاری چلت پھرت کو قبول کرے، کرو، کام کرو۔

اور ایک خاص نصیحت یہ ضرور فرماتے کہ ابھی کام سیکھ رہے ہو یا سیکھ کر آئے ہو، اصل کام ہے مقامی؛ لہٰذا مقامی طور پر خوب جم کر کام کرنا، یہ فرما کر سب سے مصافحہ فرماتے اور رخصت کرتے۔

ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ علما کی جماعت جب ملاقات کے لیے آتی، تو آپ ان سے فرماتے کہ کتنے دن ہو گئے؟ اگر وہ ایک چلے سے زیادہ بتاتے، تو آپ کا دوسرا سوال ہوتا کہ امیر بن کر چل رہے ہو یا مامور؟ اگر وہ کہتے کہ ''مامور'' تو آپ ذرا ناراض ہوتے اور کہتے کہ اب تک کام نہیں سیکھا؟ پورا چلہ گزر گیا، اب تک جماعت لے کر چلنے کی صلاحیت پیدا نہ ہوئی؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ وقت ٹھیک استعمال نہیں کر رہے ہو، صرف گھوم رہے ہو۔

غور فرمائیں! یہ کس قدر دل سوزی کے ساتھ ایک نہایت اہم تعلیم و تنبیہ ہے کہ علما کو تو فوراً کام سیکھ کر عوام کی راہ نمائی کرنی چاہیے اور کام کو عوام کے ہاتھ سے اپنے ہاتھ میں لینا چاہیے، کہ ان کے

ہاتھ رہتے ہوئے تو ہزار خرابی کا شکار ہو جائے گا، کیا آج وقت نے یہ نہیں دکھا دیا کہ علما نے جب اس مبارک کام کو اپنے ہاتھ میں نہیں لیا، تو جاہل عوام نے اس کی بالکل شکل بگاڑ دی اور گم راہی کی اس حد تک پہنچ گئے کہ جاہلوں نے ایک مرتبہ شیخ الاسلام حضرت اقدس مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب سے یہ کہہ دیا کہ ’’آپ تو دین کے کام میں رکاوٹ بن رہے ہیں‘‘

ہائے! ہائے! جس ہستی کی زندگی کا منٹ منٹ، سکینڈ سکینڈ دین کی خدمت میں گزر گیا، وہ دینی کام میں رکاوٹ بن رہا ہے؟!!. **الأمان و الحفیظ!!!**

انصاف پسندی

ماقبل میں یہ بات آچکی کہ آپ عورتوں کے لیے جماعت میں نکلنے کے قائل نہیں تھے، دارالعلوم دیوبند کا فتویٰ بھی یہی ہے؛ مگر بات صرف اتنی نہیں تھی؛ بل کہ آپ فرماتے تھے کہ جس طرح عورتوں کا جماعت میں نکلنا درست نہیں، اسی طرح لڑکیوں کا ہاسٹل والا مدرسہ بنانا بھی درست نہیں اور آپ اس کی مخالفت فرماتے تھے اور فرماتے تھے کہ انصاف کا تقاضا تو یہی ہے کہ جب فتنہ دونوں میں ہے، تو پھر دونوں کی اجازت نہیں ہونی چاہیے؛ مگر عجیب بات یہ ہے کہ حضراتِ مفتیان عورتوں کے تبلیغ میں جانے کی اجازت نہیں دیتے (جو کہ بالکل درست ہے)؛ مگر لڑکیوں کا ہاسٹل والا مدرسہ بنانے کی اجازت دیتے ہیں، یہ کون سا انصاف ہے جب کہ خرابی دونوں میں ہے؟

راقم کے بعض قریبی دوست جو بنات کے مدرسے میں کئی سال پڑھا چکے ہیں، ان سے اس سلسلے میں مذاکرے کے بعد راقم کہتا ہے کہ عورتوں کے تبلیغ میں نکلنے سے زیادہ فساد اُن کے ہاسٹل والے ادارے میں ہے؛ لہٰذا اِس کی قباحت وشناعت اور زیادہ ہونی چاہیے اور اس کے متعلق بھی عدمِ جواز ہی کا فتویٰ ہونا چاہیے، خدا کرے کہ حضرت والا کی مذکورہ بالا باتوں پر ہمارے ملک کے مفتیان دوبارہ غور فرمالیں۔

ایک سوال لوگوں کے ذہن میں اس موقع پر یہ پیدا ہوسکتا ہے کہ پھر لڑکیوں کی تعلیم کا کیا ہوگا؟

جواب اس کا حضرت والا ہی دیا کرتے تھے کہ مطلقاً لڑکیوں کا ادارہ ہی قائم نہ کیا جائے، ایسا نہیں؛ بل کہ ایسا ادارہ قائم کیا جائے کہ بچیاں دن دن میں پڑھ کر اپنے گھروں کو چلی جائیں، ہاسٹل میں قیام نہ کریں اور یہ بھی ہو کہ انھیں پڑھانے والی خواتین معلمات ہی ہوں، مردوں کا پردے کے پیچھے سے لڑکیوں کو پڑھانا فتنہ سے خالی نہیں۔

اس موقع پر بار بار قلم اُس فساد کو تحریر میں لانے کی طرف بھاگ رہا ہے، جو رفیقِ مکرم مفتی محمد آفتاب عالم صاحب (استاذِ حدیث وفقہ جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم، بنگلور) نے ہندوستان کے ایک معروف صوبے میں چند سال بنات کے مدرسے میں خدمت انجام دیتے ہوئے خود دیکھا، جب بھی وہ اس کا تذکرہ کرتے ہیں، تو سن کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور ڈر لگتا ہے کہ کہیں خدا کا عذاب نہ آجائے، یہی وجہ ہے کہ یہ بے چارے اپنے دین ودنیا کی حفاظت کے لیے وہاں کی بڑی تن خواہ کو چھوڑ کر بنین کے ایک ادارے میں نہایت معمولی تن خواہ پر خدمت کرنے لگے اور بار بار فرماتے ہیں کہ بس اللہ نے میرے دین کی اور ایمان کی حفاظت فرمادی، اس وقت اس حوالے سے دل ایسے درد میں مبتلا ہے کہ اس وقت اس تحریر میں کچھ ایسے واقعات پیش کر کے امت کے بڑوں کے سامنے بنات کے ادارے کے فساد کو ذکر کروں؛ مگر چوں کہ تحریر کا موضوع اور ہے، اس لیے اتنے اشارے سے بھی امید ہے کہ پوری حقیقت واضح ہو جائے گی۔

نوٹ: بنات کے ہاسٹل والے ادارے سے متعلق جو باتیں عرض کی گئی ہیں، وہ اکثریت کے اعتبار سے ہیں، ہوسکتا ہے ایک آدھ جگہ کا نظام قابلِ اطمینان ہو؛ مگر بات تو اکثریت کے لحاظ سے کہی جاتی ہے۔

آپ کا علمی رعب

راقم مختلف مقامات پر یہ عرض کر چکا ہے کہ آپ ہمارے والد کی طرح؛ بل کہ ان سے بھی بڑھ کر تھے، آپ بہت ہی بے تکلف رہتے تھے؛ مگر ہم پر ہمیشہ آپ کا رعب رہتا تھا، بسا اوقات میں سوچ

میں پڑ جاتا تھا کہ آپ تو ہم سے بہت ہی بے تکلف رہتے ہیں، اپنی اولاد کی طرح معاملہ کرتے ہیں، پھر بھی آپ کا اتنا رعب ہم پر کیوں رہتا ہے؟ ذہن میں یہ بات آتی رہتی تھی؛ مگر اسی رعب ہی کی وجہ سے کبھی بھی پوچھنے کی ہمت نہ ہوئی، ایک دن مجلس ہی میں کسی مناسبت سے آپ نے اپنے شیخ: حضرت شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا صاحب کاندھلوی ؒ کے متعلق فرمایا کہ آپ بہت ہی زیادہ بے تکلف رہا کرتے تھے؛ مگر اس کے باوجود ہمہ وقت ان کا علمی رعب طاری رہتا تھا، جب آپ نے یہ بات ارشاد فرمائی، تو فوراً عرصے سے دماغ میں گشت کرنے والے سوال کا جواب مل گیا، کہ آپ بھی ہمارے ساتھ بالکل بے تکلف رہتے ہیں؛ مگر وہ علمی رعب ہے، جو ہمہ وقت ہم پر طاری رہتا ہے۔

ہدیہ محبت میں دیا جاتا ہے

آج سے سات آٹھ سال پہلے جب آپ کا بائی پاس ہوا تھا، اس موقع پر آپ سے تعلق رکھنے والے بعض حضرات خود ممبئی پہنچ کر آپ کو ہدیہ پیش کر رہے تھے، آپ چوں کہ ہسپتال کے اندر خاص روم میں تھے اور ان ایام میں ہر کسی کو ملنے کی اجازت بھی نہیں تھی، تو اکثر ایسا ہو رہا تھا کہ لوگ وہاں موجود صاحب زادے یا آپ کے دوسرے قریبی رشتے دار جو وہاں موجود ہوتے، ان کو ہدیہ پیش کر کے چلے جاتے اور یہ حضرات اس خیال سے کہ یہ حضرات آپ سے محبت و تعلق رکھتے ہیں، ان کا ہدیہ قبول فرما لیتے؛ لیکن جب سے آپ نے آپریشن کے بعد ہوش سنبھالا، تو اب جو بھی اور جتنے بھی قریبی ہدیہ لے کر آتے، اسے شکریے کے ساتھ واپس فرما دیتے اور قبول نہ فرماتے، اس پر بعض بہت قریبی تعلق رکھنے والوں کو تشویش ہونے لگی کہ آخر حضرت نے ایسا کیوں کیا، حضرت ہم سے ناراض ہیں یا کوئی اور بات ہے؟ اللہ جانے ہم تو محبت میں ہدیہ پیش کر رہے ہیں اور آپ واپس کر دے رہے ہیں، خیر آپ نے آپریشن کے بعد جس وقت سے ہوش سنبھالا، کسی کا ہدیہ قبول نہیں فرمایا؛ مگر یہ بات اہلِ تعلق میں بہت زیادہ گردش کرنے لگی اور متعلقین تشویش کا اظہار کرنے لگے: چناں چہ جب آپ ممبئی سے دیوبند تشریف لے آئے اور کچھ دن گزر گئے، تو میں نے حضرت اقدس کے سامنے اہلِ تعلق

کی اس تشویش کا اظہار کیا کہ حضرت آپ نے اس موقع پر بہت سے اہلِ تعلق کا ہدیہ واپس فرما دیا، اِس پر ان میں قلبی طور پر بڑی پریشانی ہے، وہ اب تک وجہ نہیں سمجھ پا رہے ہیں کہ آخر ایسا کیوں ہوا؟ جب کہ وہ محبت میں لائے تھے، اس پر آپ نے جو جواب ارشاد فرمایا، وہ علما کی جماعت کی آنکھیں ،دل ودماغ سب کھول کر رکھ دینے والا ہے، آپ نے فرمایا کہ ''اس وقت میرا بڑا آپریشن ہوا تھا، اس میں بڑی رقم صرف ہوتی ہے، تو اس موقع پر لوگ مجھے ضرورت مند سمجھ کر پیسے دے رہے تھے، محبت میں نہیں، زبان سے کچھ بھی کہیں اور ہدیہ محبت میں دیا جاتا ہے، ضرورت مند سمجھ کر نہیں، اس لیے میں نے قبول نہیں کیا تھا''۔

ایسے وقت میں بھی اتنی باریکی سے سوچنا، بڑے استغنا کی بات ہے، کیا ایسے استغنا کی مثال ملنی آسان ہے؟

لندن سے آئے ہوئے مہمان کو ہدیہ دینا

ہدیہ لینے دینے سے متعلق یہ بھی ایک انوکھا واقعہ دیکھا، ہوا یہ کہ ایک مرتبہ دارالعلوم دیکھنے کے لیے لندن سے آئے ہوئے کچھ مہمان آپ کے پاس آئے ہوئے تھے، چائے پانی کے بعد جب وہ واپس ہونے لگے، تو آپ نے اپنے صاحب زادے حضرت مولانا مفتی حسین صاحب کو آواز دی، وہ حاضر ہو گئے، آپ نے فرمایا کہ تین ہزار روپئے لاؤ، وہ فوراً یہ رقم لے کر حاضر ہو گئے، حضرت والا نے یہ رقم لے کر لندن سے آئے ہوئے مہمان کو یہ کہہ کر دیا کہ یہ میری طرف سے آپ کو ہدیہ ہے، آپ کے اس عمل سے ان کو ایک اچنبھا سا ہوا اور انھوں نے کہا کہ حضرت ہمیں آپ کو ہدیہ دینا چاہیے، الٹا آپ ہمیں ہدیہ دے رہے ہیں؟ اس پر آپ نے فرمایا کہ میں آپ لوگوں کے یہاں آتا ہوں، تو آپ لوگ ہدیہ دیتے ہیں، اب آپ میرے یہاں آئے ہیں، تو آپ لوگ میری طرف سے ہدیہ قبول کریں، اس پر انھوں نے شکریے کے ساتھ قبول فرمالیا۔

اس موقع پر راقم کو بابِ ''تفاعل'' (تَهَادَوا، تَحَابُّوا) کا خاصہ (جانبین سے کسی کام کا ہونا)

عملاً خوب اچھی طرح سمجھ میں آیا؛ ورنہ بالعموم ایسا دیکھنے کو نہیں ملتا ہے کہ علما صرف ہدیہ قبول کرتے ہیں اور بس۔

شریعت پر عمل کا ایک عجیب واقعہ

آج سے تقریباً آٹھ سال پہلے جب حضرت الاستاذ کے دل کا آپریشن ہوا تھا، اس وقت راقم شعبۂ افتا کا طالبِ علم تھا، اسی سال الحمدللہ، اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل وکرم سے حضرت اقدس کی خدمت میں رہنے کا خوب موقع عطا فرمایا؛ چناں چہ آپریشن کے بعد شروع ایام میں جب آپ کے لیے حفظانِ صحت کی خاطر زیادہ جھکنے کی پابندی تھی اور طبیعت ابھی پوری طرح سنبھلی نہیں تھی، تو اس وقت ہم آپ کے لیے وضو کا پانی بہاتے اور آپ اپنے چہرے اور ہاتھ کو دھوتے، اس کے بعد جب پیر دھلنے کا وقت ہوتا، تو میں ایک ہاتھ سے پانی بہاتا اور ایک ہاتھ سے آپ کے قدم مبارک کو رگڑتا، یہ سلسلہ چلتا رہا؛ کچھ دنوں بعد جب آپ کی طبیعت میں مزید بہتری آئی، تو ایک دن حسبِ معمول جب میں قدم مبارک کو دھونے گیا، تو آپ نے فرمایا کہ رکو! ایک مسئلہ سنو! حضراتِ فقہا نے وضو میں بلاضرورت استعانت بالغیر کو مکروہ لکھا ہے؛ اس لیے اب تک تو مجھے ضرورت محسوس ہو رہی تھی اور تم پیر دھلا دیا کرتے تھے، تو کوئی حرج نہیں تھا؛ مگر اب مجھے ایسا لگتا ہے کہ میں خود دھل سکتا ہوں؛ لہٰذا تم اب چھوڑ دو؛ ورنہ کراہت لازم آئے گی۔

نوٹ!

حضرت والا کے اس عمل کو لکھتے وقت جب اس ناکارے نے ''شامی'' دیکھی، تو حیرت کی انتہا نہ رہی کہ آپ کو چھوٹی چھوٹی جزئیات کس قدر مستحضر تھیں اور کس طرح آپ ان پر عمل پیرا رہتے تھے، اللہ اکبر! علامہ شامی رحمہ اللہ اپنی کتاب میں وضو میں غیر سے تعاون لینے کے متعلق بحث کا خلاصہ پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اگر تعاون اس طور پر لیا جائے کہ غیر سے کہہ دے کہ وضو کا پانی لا دو یا یہ کہہ دے کہ ذرا پانی اعضا پر ڈال دو، تو ایسی صورت میں کسی طرح کی کوئی کراہت نہیں، یعنی متوضی نے یہ کام

دوسرے سے عذر کی بنا پر لیا یا بغیر عذر کے کسی صورت میں کوئی کراہت نہیں اور اگر متوضی غیر سے تعاون اعضا کو دھونے، مسح کرنے وغیرہ میں لیتا ہے، تو یہ تعاون اگر عذر کی بنا پر لے رہا ہے، تو کوئی کراہت نہیں اور اگر بغیر عذر کے لے رہا ہے، تو پھر یہ مکروہ ہے۔

اب اس عبارت کی روشنی میں حضرت الاستاذ کے عمل کو دیکھتا ہوں، تو سو فی صد آپ اس جزیئے پر عمل کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، آپ نے طبیعت کے کچھ بہ حال ہونے کے بعد پیروں کو دھونے سے روک دیا تھا؛ البتہ پانی ہم ڈالتے تھے اور آپ خود اعضا کو دھوتے تھے۔

شامی کی عبارت بھی ملاحظہ فرمالیجیے:

> **وحاصله أن الاستعانة في الوضوء إن كانت بصب الماء أو استقائه أو إحضاره فلا كراهة بها أصلاً ولو بطلبه، وإن كانت بالغسل والمسح فتكره بلا عذر، ولذا قال في التاترخانية: ومن الآداب أن يقوم بأمر الوضوء بنفسه، ولو استعان بغيره جاز بعد أن لا يكون الغاسل غيره بل يغسل بنفسه.**

(رد المحتار على الدر المختار،الطهارة :مطلب في مباحث الاستعانة في الوضوء بالغير :۱/ ۲۲۵، ط: دارالکتاب، دیوبند)

جو گاڑی لیٹ ہوگئی، اسے لیٹ ہونے دو

فقہی جزئیات کے استحضار کا ایک اور واقعہ بھی پڑھتے چلیے، ایک دن عصر کے بعد مجلس میں کسی نے آپ سے مسئلہ معلوم کیا کہ حضرت! ظہر کی سنتِ قبلیہ اگر چھوٹ جائے، تو اسے فرض کے بعد جو دو رکعت سنت ہے، اسے ادا کرنے کے بعد ادا کرنی ہے یا فرض کے بعد فوراً پہلے والی چار رکعت پڑھنی ہے؟ پھر بعد والی دو رکعت؟ آپ نے مسکراتے ہوئے فرمایا کہ ''جو گاڑی لیٹ ہوگئی، اسے لیٹ ہونے دو''یعنی اب پہلے والی چار رکعت تو اپنے وقت پر ادا نہ ہوسکی؛ لہٰذا اُس کی ادائیگی کے لیے اب

بعد والی دو رکعتوں کو اس کے وقت سے کیوں مؤخر کیا جائے؛ لہٰذا فرض مکمل ہونے کے بعد پہلے بعد والی دو رکعت سنتِ مؤکدہ پڑھ لی جائے، پھر پہلے والی چار رکعت پڑھی جائے؛ تاکہ ایک ہی سنت اپنے وقت سے مؤخر ہو؛ دونوں نہ ہوں، آپ کا یہ جواب جب راقم نے سنا، تو بہت ہی پسند آیا؛ مگر اس وقت اپنی نادانی کی وجہ سے یہ خیال ہوا کہ حضرت نے یہ جواب عقلاً دیا ہے؛ مگر کئی سال بعد جب ''جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم'' میں ''**شرح الوقایۃ**'' کا سبق راقم سے متعلق ہوا اور دورانِ سبق یہ بحث آئی کہ سنتوں میں قضا صرف فجر اور ظہر کی سنتوں کی ہے اور صاحبِ ''**شرح الوقایۃ**'' نے لکھا کہ ظہر سے پہلے کی چھوٹی ہوئی سنتِ مؤکدہ ظہر کی فرض کے بعد فوراً ادا کی جائے گی اور فرض کے بعد جو دو رکعت سنتِ مؤکدہ ہے، اسے اس کی ادائیگی کے بعد ادا کیا جائے گا؛ مگر وہیں علامہ عبدالحئی صاحب لکھنوی رحمہ اللہ نے حاشیے میں اس قول کی تردید کرتے ہوئے فرمایا کہ زیادہ صحیح دوسرا قول ہے، یعنی فرض کے بعد پہلے بعد والی سنتِ مؤکدہ ادا کی جائے گی، اس کے بعد پہلے کی چھوٹی ہوئی چار سنتِ مؤکدہ اور حضرت نے وجہ لکھی کہ پہلے والی سنتِ مؤکدہ کو ادا کرنے کے لیے اب دوسری والی کو اس کے وقت سے ہٹانے کی کوئی ضرورت نہیں اور ''ترمذی شریف'' کی حدیث سے بھی یہی بات ثابت ہوتی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اگر کبھی ظہر کی سنتِ قبلیہ رہ جاتی، تو آپ اسے ظہر کے بعد والی دو سنت کے بعد ادا فرماتے تھے۔　　**(شرح الوقایۃ مع ھامشہ عمدۃ الرعایۃ :۱/۱۸۰)**

جب تدریس کے دوران یہ عبارت سامنے آئی، تو اپنے پہلے خیال پر بڑی شرمندگی ہوئی اور حضرت الاستاذ کا شان دار جواب اور مختلف فیہ جزیئے میں بھی مختار اور پسندیدہ قول کے استحضار پر بڑا رشک آیا۔

سوال کا جواب دینے میں آپ کا نرالا انداز

سبق میں، عمومی بیان میں جیسا کہ مشہور و معروف اور مشاہد تھا کہ آپ بات کو خوب کھول کر بہت ہی آسان انداز میں سمجھاتے تھے؛ مگر جب عصر بعد کی مجلس میں طلبہ آپ سے کوئی سوال کرتے، تو

آپ قدرے مختصر انداز میں جواب اس طرح دیتے کہ طلبہ کی فہم کا بھی اندازہ فرما لیتے، چناں چہ ایک مرتبہ مجلس میں آپ کے ایک قریبی شاگرد نے سوال کیا کہ حضرت اگر دورانِ وضو کوئی سلام کرے، تو وضو کرنے والے پر اس کا جواب دینا ضروری ہے، یا نہیں؟ اس پر آپ نے بڑے نرالے انداز میں فرمایا کہ ''وضو کرنے والا وضو کے درمیان پڑھے جانے والے اذکارِ مسنونہ کا وِرد کر رہا ہے یا نہیں؟ آپ نے صراحتاً جواب دینے کے بجائے ایسا سوال قائم فرمایا کہ اس سے جواب خود بہ خود نکل آیا کہ پہلی صورت میں واجب نہیں، دوسری صورت میں واجب ہے؛ مگر آپ صرف اتنا کہہ کر خاموش ہو گئے، طالبِ علم ذہین تھا، اسے فوراً بات سمجھ میں آ گئی وہ مطمئن ہو کر خاموش ہو گیا۔

مگر ایسے ہی مواقع پر بعض گھامڑ قسم کے طلبہ کو دیکھا جاتا ہے کہ وہ جواب پر توجہ دیتے ہیں نہ ہی غور کرتے ہیں، بس بلا وجہ دوبارہ سہ بارہ اسی سوال کو مختلف انداز سے پوچھتے رہتے ہیں انہیں تسلی نہیں ہو پاتی مثلاً: اسی موقع پر اگر کوئی ایسا طالبِ علم ہوتا تو پلٹ کر پھر پوچھتا کہ اگر مسنون اذکار کا ورد کر رہا ہے، تو جواب ضروری نہیں؟ اور اگر نہیں کر رہا ہے، تو ضروری ہے؟ ظاہر ہے کہ اب اس سوال کی کیا ضرورت، بات تو واضح ہو چکی۔

یہی وجہ تھی کہ جب طالبِ علم بال کی کھال نکالنے لگتا اور بار بار مختلف انداز سے سوال کو دہراتا اور آپ کی بات میں غور نہیں کرتا؛ تو آپ ناراض ہوتے اور فرماتے کہ بات کو غور سے سننا چاہیے اور کم بولنا چاہیے، چناں چہ ایک مرتبہ راقم نے خود دیکھا کہ ایک طالب علم نے جو غالباً پہلی یا دوسری مرتبہ مجلس میں حاضر ہوا تھا، آپ سے کوئی سوال کیا، آپ نے حسبِ عادت مختصراً جواب دے دیا؛ مگر اس نے جواب پر اچھی طرح غور نہیں کیا کہ اسے بات سمجھ میں آ جاتی اور اطمینان ہو جاتا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ آپ کا جواب سن کر خاموش رہنے کے بہ جائے آپ ہی کے جواب کو پھر دہرانا شروع کر دیا، طالبِ علم کے ذرا دور بیٹھے ہونے کی وجہ سے آپ پوری طرح اس کی بات سن نہ سکے، قریب بیٹھے ہوئے حضرت مفتی اشتیاق احمد صاحب (استاذ دار العلوم دیوبند) سے معلوم کیا کہ یہ اب کیا کہہ رہا ہے؟ مفتی اشتیاق احمد صاحب تو پوری طرح آپ کے مزاج و مذاق کو سمجھے ہوئے تھے، وہ خوب

سمجھ رہے تھے کہ طالبِ علم ناسمجھی کا ثبوت دے رہا ہے؛ لہٰذا ذرا طنزیہ انداز میں فرمایا کہ آپ کی بات کی تشریح کرر ہا ہے، آپ نے فرمایا کہ میری بات کی تشریح کرر ہا ہے؟ کرو! لیکن عجیب بات تھی کہ وہ طالبِ علم اب بھی نہیں سمجھ پایا، بس بولتا ہی جارہا تھا کہ اب آپ نے ذرا غصے میں فرمایا کہ مفتی اشتیاق احمد صاحب نے تم پر چوٹ کسی، پھر بھی تمھیں سمجھ نہیں آئی، بس بولتے جارہے ہو! بولتے جارہے ہو! اب جاکر وہ طالبِ علم خاموش ہوا، پھر آپ نے فرمایا کہ میں حضرت الاستاذ علامہ بلیاوی رحمہ اللہ کے سر پر تیل رکھتا تھا؛ مگر اکثر اوقات خاموش رہتا تھا، آپ کے بولنے کا انتظار کرتا تھا؛ بل کہ میں تو آپ کی خاموشی سے بھی بہت کچھ سیکھتا تھا۔

بڑوں کی مجلس میں کم بولنا چاہیے، یہ آپ کی بڑی اہم نصیحت تھی، آج طلبہ اس سے بالکل ناواقف ہیں، انھیں آگے آگے بولنے اور فضول قسم کے سوالات کرنے کی بڑی عجیب بیماری لاحق ہوچکی ہے، اس پر خصوصی توجہ کی ضرورت ہے، حضرت الاستاذ فرمایا کرتے تھے کہ ”طالب علم کو اگر کوئی علمی اشکال ہو؛ تو وہ استاذ سے کرنا چاہیے، ورنہ خاموش رہنا چاہیے“۔

تائید سے توقف

ایک موقع سے بنگلور میں ایک شخص کے کاروبار کا شرعی نقطۂ نظر سے جائزہ لیا گیا، راسخ فی العلم علما کی جماعت اس نتیجے پر پہنچی کہ اس وقت کاروبار کی جو شکل بتائی گئی ہے، وہ شریعت کے معاشی کسی اصول کے معارض نہیں، دوسری ایک جماعت نے یہ رائے قائم کی کہ کاروبار درست نہیں، جب ان سے دلیل طلب کی گئی کہ جس شرعی اصول کے پیشِ نظر درست نہیں ہے، وہ سامنے لائی جائے؛ تاکہ غور کیا جاسکے، تو آج تک بھی دوسری طرف سے کوئی معقول دلیل نہ آسکی (جب تھی ہی نہیں، تو آتی کہاں سے)؛ مگر پھر بھی بغیر دلیل کے عدمِ جواز پر اصرار رہا اور ”کھسیانی بلی کھمبا نوچے“، جب دلیل کچھ نہ رہی، تو پھر بے لگام ہو گئے اور حد سے تجاوز کرنے لگے، اس موقع پر مناسب سمجھا گیا کہ ایک وضاحتی تحریر آجائے، ہوسکتا ہے کہ اس میں مریضوں کے درد کی دوا ہو، اگر وہ صحیح طور پر دوا کا استعمال

کر کے اپنی شفا چاہتے ہوں؛ لہٰذا ایک نہایت ہی محققانہ، عالمانہ، اصولیانہ، اصولِ شریعت کی جامع، مبنی بر انصاف تحریر نہایت ہی سوزِ دل کے ساتھ بڑی ہی ہم دردی اور شفقت کے ساتھ لکھی گئی؛ مگر اس کا بھی کوئی اثر نہ ہوا، خیر! یہ تحریر حضرت الاستاذ کے پاس دیوبند بھیجی گئی کہ آپ توثیق فرما دیں، باوجودے کہ اصولِ شرع کے مطابق اس تحریر کی ایک ایک بات درست تھی اور لکھنے والے کے علم وفضل پر بھی آپ کو کامل نہیں؛ بل کہ اکمل درجے کا اطمینان تھا، بڑی محبت بھی فرماتے تھے، مگر شریعت کا ایک اصول کہ ''جانبین کی بات سن کر فیصلہ کرنا چاہیے'' کے پیشِ نظر وقتی طور پر آپ نے تحریر لے جانے والے سے کہا کہ یہ تو ایک طرف کی بات ہے؛ لہٰذا ابھی میں ایک طرف کی بات سن کر کوئی فیصلہ نہیں کروں گا اور کچھ نہیں لکھوں گا، یہ فرما کر آپ نے تائید سے وقتی توقف فرمالیا، حضرت الاستاذ کا یہ عمل نہایت ہی توجہ کا حامل ہے، بالعموم ایسا دیکھا جاتا ہے لوگ کسی بھی معاملے میں ایک طرف کی بات سن کر فوراً ایک ذہن بنا لیتے ہیں، اتنی بھی زحمت نہیں کرتے کہ ذرا تحقیق حال تو کر لیں تاکہ صحیح صورت حال واضح ہو جائے۔

میرا ایک خواب

جب حضرت والا کا بائی پاس ہوا اور آپ ممبئی سے دیوبند اپنے گھر تشریف لائے، تو شروع ایام ہی سے کوشش کرنے لگے کہ کھڑے ہو کر نماز پڑھیں، اس وقت سائے کی طرح ساتھ رہنے والے اور ڈاکٹری کے فن سے کافی حد تک واقف: جناب عمار بھائی صاحب، جو ممبئی میں رہتے ہیں، وہ بھی ساتھ دیوبند آ گئے تھے، وہ مسلسل آپ سے عرض کرتے کہ ابھی باضابطہ قیام ورکوع وغیرہ کے ساتھ آپ نماز نہ پڑھیں، تکلیف بڑھ جائے گی؛ مگر آپ کو بیٹھ کر نماز پڑھنے سے اطمینان نہیں ہوتا، چند دنوں تک تو کسی طرح ان کی بات مان کر بیٹھ کر نماز پڑھی؛ مگر پھر کھڑے ہو کر باضابطہ طور پر رکوع سجدے کے ساتھ نماز پڑھنے لگ گئے، نتیجتاً ہوا وہی جس کا اندیشہ تھا، آپ کی تکلیف بڑھنے لگ گئی، ان ہی دنوں راقم نے یہ خواب دیکھا کہ آپ بالکل برہنہ پا سنگریزوں پر تیزی سے چلنے کی کوشش

کررہے ہیں، آپ کے قدم مبارک بھی ٹھیک سے نہیں رکھے جارہے ہیں، پھر بھی تیزی سے عصا کے سہارے چل رہے ہیں، دروازے پر پردے میں کھڑے ہوکر امی جان (آپ کی اہلیہ محترمہ) اس ناکارے سے فرمارہی ہیں کہ دیکھو! یہ بالکل احتیاط نہیں کررہے ہیں، اس طرح چل رہے ہیں۔

اگلے دن جب میں خدمت میں حاضر ہوا، تو میں نے عرض کیا کہ آج رات میں نے ایک خواب دیکھا ہے، آپ نے فرمایا کہ سناؤ! میں نے اوپر ذکر کردہ خواب سنایا، سن کر خاموش رہے، اپنے صاحب زادے مفتی حسین صاحب کو بلایا، اس کے بعد مجھ سے فرمایا کہ اب ان کے سامنے وہ خواب دوبارہ عرض کرو، میں نے پھر اسی طرح خواب سنایا، اب سنانے کے بعد آپ نے تعبیر یہ دی کہ مجھے ابھی کھڑے ہوکر نماز نہیں پڑھنی چاہیے، ابھی مزید احتیاط کرنی چاہیے، یہ ہے اس خواب کی تعبیر، جس میں تمہاری والدہ (مفتی حسین صاحب کی) احتیاط نہ کرنے کی شکایت کررہی ہیں، اس کے بعد آپ نے طبیعت کے سنبھلنے تک بیٹھ کر نماز ادا فرمائی۔

میں کسی کے ماضی کو نہیں دیکھتا

مولانا سلمان ندوی صاحب نے ایک مرتبہ مولانا کلیم صدیقی صاحب سے کسی بات پر ناراض ہوکر ''کلیم پھلتی'' کے نام سے ایک کتاب لکھ دی اور ان کی شخصیت کو مجروح کرنے کی ناکام کوشش کی؛ مگر حقیقت یہ ہے کہ اللہ جسے عزت دیں، اسے کون ذلیل کرسکتا ہے؟ ان ہی دنوں کی بات ہے کہ عصر کے بعد میں حضرت اقدس کی خدمت میں بیٹھا ہوا تھا کہ اسی دوران غالبًا تین افراد پر مشتمل ایک وفد آیا اور انھوں نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ ہم مولانا سلمان ندوی صاحب کی طرف سے آپ کی خدمت میں ایک پیغام دے کر بھیجے گئے ہیں، وہ یہ ہے کہ جناب کلیم پھلتی صاحب کے یہاں سے ابھی جو ''ارمغان'' کا ایک خصوصی شمارہ شائع ہورہا ہے (یا ہوا ہے، کہا)، اس میں آپ نے بھی کچھ تحریر فرمایا ہے، جس سے انھیں تقویت ملے گی، جب کہ وہ ایسے ہیں، ویسے ہیں یعنی بہت سی منفی باتیں ان کے بارے میں آپ سے کہی گئیں، اس کے بعد وفد نے کہا کہ حضرت مولانا سلمان

صاحب ندوی یہ چاہتے ہیں کہ آپ تائید سے رجوع فرمالیں، یہ بات سن کر آپ نے بڑے اطمینان سے فرمایا کہ میں نے جناب کلیم پھلتی صاحب کو بھیجے جانے والے مضمون میں تین باتیں لکھی ہیں اور ان تینوں پر پورے اطمینان کے بعد لکھا ہے اور میں نے خود تجربہ کیا ہے کہ وہ کوئی دنیادار لالچی انسان نہیں ہے اور پھر فرمایا کہ ایک مرتبہ بغیر کسی پیشگی اطلاع کے میں مولانا کلیم صدیقی کے گھر پہنچ گیا، وہ مجھے اپنے گھر لے گئے، تو میں نے بالکل سادہ پایا، وہاں کوئی ٹھاٹ باٹ نہیں تھا، جب کہ دنیا کے طلب گاروں کو جب دنیا ملتی ہے، تو پھر وہ سب سے پہلے اپنی رہن سہن ٹھیک کرتے ہیں، اس کے بعد ایک اور نہایت قیمتی بات ارشاد فرمائی کہ ''میں کسی کے ماضی کو نہیں دیکھتا؛ بل کہ حال کو دیکھتا ہوں، ماضی تو ہر کسی کا کچھ نہ کچھ خراب ہوتا ہے؛ لہٰذا اپنی بات سے رجوع کرنے کی کوئی وجہ نہیں، میں نے جو کچھ لکھا ہے، اس پر مکمل اطمینان ہے، آپ حضرات تشریف لے جائیں، مولانا صاحب کو میرا سلام سنائیں اور یہ بات بتادیں''۔

یہاں ایک بات خصوصیت سے قابلِ ذکر ہے، وہ یہ کہ حضرت والا کی ایک خاص بات یہ تھی کہ کوئی انسان ہزار کوششوں سے بھی، کسی دوسرے سے آپ کا دل کھٹا نہیں کر پاتا تھا، آپ کبھی بھی کسی کی بھی بات سن کر کسی سے ادنیٰ بدظن نہیں ہوتے تھے، جب کہ آج کل کچھ لوگ صرف اسی کام کے لیے ہوتے ہیں کہ کبھی اِس سے بدظن کردیا کبھی اُس سے اور عجیب بات ہے کہ تحقیق حال کے بغیر ہی لوگ ایک دوسرے سے بدظن ہوجاتے ہیں، یہ کس قدر خطرناک بات ہے اس سے تو فتنہ پھیلانے والوں کا حوصلہ اور بڑھے گا۔

آپ کی جرأت کو سلام

آپ کے عمدہ اوصاف میں سے ایک نمایاں وصف ہے، آپ کی حق گوئی و جرأت و بے باکی، اچھے اچھے جرأت منداور بے باک بسا اوقات حالات و ماحول کے تقاضے سے متأثر ہوجاتے ہیں، حکمت و مصلحت کے پھول کی خوش بو اُنھیں ایسا موہ لیتی ہے کہ اُنھیں بادلِ ناخواستہ ہی سہی؛ مگر

مصالحت کرنی پڑتی ہے اور حق بات کہنے سے رکنا پڑتا ہے؛ مگر سلام ہو آپ کی جرأت و بے باکی پر کہ ساری زندگی میں کبھی بھی آپ کی حق گوئی کی راہ میں کسی بھی طرح کی حکمت و مصلحت حائل نہ ہوسکی، آپ نے حق کے مقابلے میں کبھی سمجھوتہ نہیں کیا، ساری عمر آپ کی فکر صرف اور صرف یہی رہی کہ دینِ حنیف اپنے صحیح شکل میں باقی رہے، کسی بھی طرح کا داغ ودھبہ اُس کی خوبصورت شکل پر لگنے نہ پائے، اسی جرأت و بے باکی کا ایک عجیب واقعہ پیش آیا، جب دارالعلوم دیوبند میں آج سے تقریباً آٹھ نو سال پہلے ''رابطۂ مدارس'' کا اجلاس ہو رہا تھا۔

واقعہ یہ پیش آیا کہ جلسے میں خطاب کرتے ہوئے حضرت خطیب الاسلام جناب مولانا محمد سالم صاحب قاسمی رحمہ اللہ (سابق مہتمم دارالعلوم [وقف] دیوبند) نے فرمایا کہ دعوت صرف مذہب کی دینی چاہیے مسلک کی نہیں۔ (صرف دینِ اسلام میں داخل ہونے کی دعوت دینی چاہیے، مسلک کی دعوت نہیں دینی چاہیے، اب کوئی غیر مقلد بن کر رہے یا مودودی یا دیوبندی کچھ حرج نہیں)، حضرت خطیب الاسلام رحمہ اللہ، چوں کہ اس وقت بہت ضعیف ہو چکے تھے؛ اس لیے آواز بہت صاف نہیں آرہی تھی، حضرت والا کے خطاب کے بعد حضرت الاستاذ کا خطاب تھا، حضرت الاستاذ قریب ہی تشریف فرما تھے اور وہیں حضرت اقدس مولانا سلمان صاحب بجنوری (استاذ دارالعلوم دیوبند) بھی تشریف رکھتے تھے، حضرت الاستاذ نے حضرت مولانا سلمان صاحب سے معلوم کیا کہ حضرت خطیب الاسلام رحمہ اللہ کیا بیان فرما رہے ہیں؟ اس استفسار پر حضرت مولانا سلمان صاحب نے جواب دیا کہ یہ فرما رہے ہیں کہ دعوت صرف مذہب کی دی جائے گی، مسلک کی نہیں۔ خیر! حضرت خطیب الاسلام رحمہ اللہ کا بیان مکمل ہوا، ضعف کی وجہ سے آپ کے لیے مزید بیٹھنا دشوار تھا؛ چناں چہ خدام کے ساتھ آپ تشریف لے گئے، فوراً حضرت الاستاذ رحمہ اللہ کا نمبر آیا، آپ نے خطبۂ مسنونہ کے بعد بغیر کسی تاخیر کے نہایت ہی صاف اور صریح الفاظ میں (حکمت و مصلحت کے پھول کو ایک طرف کرکے) فرمایا کہ جناب حضرت مولانا محمد سالم رحمہ اللہ صاحب نے جو بات بیان فرمائی ہے، وہ غلط ہے، دعوت مذہب کی بھی دی جائے گی اور مسلک کی بھی، ہاں! اب آگے حنفی مسلک یا شافعی یا مالکی یا

حنبلی کی دعوت نہیں دی جائے گی؛ کیوں کہ چاروں برحق ہیں، پھر ایسی صورت میں کسی ایک کی دعوت دینے کا کیا مطلب؟ اس کے بعد پھر آپ نے حسبِ عادت مزید وضاحت سے اس بات کو سمجھایا کہ دیکھو! دو دائرے ہیں، ایک بڑا دائرہ ہے یہ دائرہ اسلام ہے، اس کے بعد ایک چھوٹا دائرہ ہے، یہ دائرہ اہل سنت والجماعت ہے؛ لہٰذا پہلے دائرے میں بھی آنے کی دعوت دی جائے گی اور دوسرے میں بھی آنے کی دعوت دی جائے گی، ہاں اب چوں کہ اہل سنت والجماعت میں چاروں مسالک داخل ہیں؛ لہٰذا اِن میں سے کسی کو بھی اختیار کیا جاسکتا ہے، ان میں سے کسی ایک کو اختیار کرنے کی دعوت نہیں دی جائے گی، افہام وتفہیم کے اس دل کش اور دل ربا انداز نے ہر ایک کو بہ آسانی حقیقت سمجھادی اور ہر چہرے پر خوشی کے آثار جھلکنے لگے۔

آپ کی اس جرأت کا صحیح اندازہ اسی انسان کو ہوسکتا ہے، جو دیوبند میں ''قاسمی خاندان'' کی وجاہت اور مقبولیت سے واقف ہے؛ مگر مسلکِ دارالعلوم کی حفاظت ضروری تھی، جس کا بیڑا آپ نے زندگی بھر اٹھایا ہوا تھا؛ اس لیے آپ کی حق گوئی کی راہ میں کوئی چیز حائل اور مانع نہ بن سکی اور آپ وہ بات کہہ گئے، جو لوگوں کے ذہن میں تو تھی؛ مگر زبان پر لانے کی ہمت اس ایک دین کے مستانے کے علاوہ کسی میں نہیں تھی۔

آپ کے حلم کا ایک عجیب واقعہ

آپ کے محلے اور محلے کے آس پاس کے فقرا کو آپ کی سخاوت کا بہ خوبی علم تھا، آج سے آٹھ دس سال پہلے جب کہ فقرا کو لوگ روپیہ، دو روپیہ، پانچ روپیہ عام طور پر دیا کرتے تھے، اس وقت آپ بیس تیس؛ بل کہ پچاس روپئے تک عام حالت میں دیتے تھے اور اگر کوئی اپنی کسی ضرورت کا اظہار کردیتا، تو پھر اس ناکارے نے پانچ سو تک آج سے آٹھ دس سال پہلے دیتے دیکھا ہے، آپ کی اسی سخاوت والی عادتِ شریفہ کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک فقیر نے (جو تھوڑے وقفے سے حضرت کے گھر کا چکر لگاتا تھا، میں خود بھی اسے کئی بار دیکھ چکا تھا) آپ سے کچھ رقم مانگی، یہ کہہ کر کہ

دوا لینی ہے، یہ سائل دروازے پر کھڑا تھا، آپ اندر بیٹھے تھے، ایسا لگا کہ اس سائل کی پوری بات آپ سن نہیں سکے؛ مگر بہ ہرحال اس کی شکل آپ دیکھ چکے تھے اور وہ بار بار آتا بھی تھا؛ اس لیے آپ نے حسبِ عادت بیس روپیہ نکال کر اسے دے دیا اور اس وقت شاید آپ کی جیب میں اتنے ہی پیسے رہے ہوں؛ اس لیے کہ جیب میں پیسے رکھنے کی آپ کی عادت نہیں تھی، بیس روپئے جب ایک طالبِ علم کے ذریعے اس کے ہاتھ میں پہنچے، تو اس فقیر نے کہا کہ ہمیں تو دوا لینی ہے، اتنے میں دوا کہاں ہوگی؟ یہ کہہ کر وہ فقیر اسی طالبِ علم کے ذریعے پیسے واپس کرنے لگا، جب وہ واپس کرنے لگا، تو آپ کی نگاہ اس پر پڑ گئی اور آپ نے دیکھ لیا کہ وہ پیسا واپس کر رہا ہے؛ مگر قربان جاؤں آپ کے حلم وتحمل پر، کہ پیشانی پر بل تک نہیں آیا، فقیر کو ایک لفظ کچھ نہیں کہا، صرف طالبِ علم سے فرمایا کہ نہیں لے رہا ہے، تو واپس لے آؤ۔

بھائیو! حقیقت بتاؤ! سچائی کے ساتھ کہو کہ کسی کے پاس ﴿وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلاَ تَنْهَرْ ۝﴾ [الضحیٰ: ۱۰] پر عمل کی ایسی مثال ہے؟ خدایا! حضرت کو اپنی شایانِ شان بہترین صلہ عطا فرمایئے۔

طلبہ کے حوالے سے میرا دل صاف رہنے دو

حضرت مولانا مرغوب الرحمان صاحب رحمہ اللہ کی وفات جس سال ہوئی، اس سال میں تکمیلِ ادب میں تھا، آپ کی وفات کے بعد حضرت اقدس مولانا غلام محمد وستانوی صاحب زید مجدہم کو کثرتِ رائے کے ذریعے مہتمم منتخب کیا گیا، اس پر طلبۂ دار العلوم دیوبند میں سے بعض اکسائے جانے پر اپنی نادانی سے دار العلوم کے اندر کی خوش گوار فضا کو مکدر کرنے لگے، ان ہی ایام میں ایک واقعہ یہ پیش آیا کہ حضرت الاستاذ جب مغرب کے بعد سبق پڑھانے کے لیے دار الحدیث تشریف لے گئے، تو کچھ نکمے قسم کے طلبہ نے لائٹ کاٹ دی، اتنا ہونا تھا کہ آپ گھر واپس تشریف لے آئے، اگلے دن چند ایک طلبہ حضرت کے پاس آئے، جو اُن طلبہ کے عمل کو برا سمجھ رہے تھے، (اور یقیناً برا تھا) عصر کی نماز سے فراغت کے بعد ساتھ چلتے ہوئے ان طلبہ نے کہا کہ حضرت ہم چاہتے ہیں کہ کل

جن طلبہ نے آپ کے ساتھ گستاخی کی ہے اور لائٹ کاٹ کر آپ کو سبق سے روکا ہے، ان کے خلاف سخت کارروائی ہو، اتنا سننا تھا کہ فوراً آپ چلتے چلتے رک گئے اور گھر کے دروازے کے باہر ہی کھڑے ہوکر اِن آنے والے طلبہ سے کہا کہ انھوں نے میرے ساتھ کوئی بدتمیزی نہیں کی ہے، اصل بات یہ ہے کہ انھیں ہنگامہ کرنا تھا، اگر میرا سبق ہوتا، تو وہ یہ نہ کر پاتے؛ اس لیے انھوں نے ایسا کیا، مقصود مجھے سبق سے روکنا نہیں تھا؛ لہٰذا تم لوگ کسی بھی طالبِ علم کے حوالے سے میرے ذہن اور دل کو گندا نہ کرو، میں سبق میں اس حال میں جانا چاہتا ہوں کہ میرا دل ایک ایک طالبِ علم کے حوالے سے بالکل صاف ہو؛ لہٰذا تم لوگ یہاں سے چلے جاؤ، یہ کہہ کر آپ نے ان طلبہ کو وہیں سے رخصت کر دیا اور گھر پر اوپر چڑھنے بھی نہیں دیا۔

اللہ اکبر! کوئی تو پیش کرے کہ اتنے بڑے دل والا کسی نے موجودہ دور میں دیکھا ہے؟!!

آپ کے سچ بولنے کا ایک واقعہ

ایک مرتبہ آپ نے فرمایا کہ میں جب ''مظاہرِ علوم'' میں طالب علم تھا، اس وقت ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ میں کچھ طلبہ کے ساتھ مشاعرہ سننے چلا گیا، اتفاق سے ناظم صاحب نے حاضری لے لی، ہم غیر حاضر ہو گئے؛ لہٰذا اگلے دن صبح کو ان تمام طلبہ سے جو غیر حاضر تھے، حضرت ناظم صاحب نے پوچھا کہ کل تم لوگ کہاں گئے تھے، ہر طالب علم کوئی نہ کوئی جھوٹا بہانہ بنا کر ایک دو چھڑی کھا کر نکل جا رہا تھا، جب میرا نمبر آیا، تو ناظم صاحب نے فرمایا کہ گجراتی! تو کہاں گیا تھا؟ میں نے بالکل صاف اور سچ بتا دیا کہ حضرت مشاعرہ سننے گیا تھا، اس پر ناظم صاحب نے فرمایا کہ گجراتی سچ بول رہا ہے، گجراتی سچ بول رہا ہے اور یہ کہہ کر ناظم صاحب نے چھوڑ دیا۔ دیکھئے یہ ہے ''الصدق ينجي'' سچ انسان کو بچا لیتا ہے۔

ایک لطیفہ

ایک مرتبہ مجلس میں ہم خوشہ چیں بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک فون آیا، فون کرنے والے نے اپنے

مختصر تعارف کے بعد یہ کہا کہ حضرت! مجھ سے آپ کی غیبت ہوگئی ہے، اب بڑا نادم ہوں معاف فرما دیجیے، آپ نے ظریفانہ انداز میں مسکرا کر فرمایا کہ کیوں معاف کروں؟ میں بھی تو انسان ہوں، مجھ سے بھی تو کسی نہ کسی کی غیبت ہوگئی ہوگی؛ لہٰذا قیامت کے دن تجھ سے نیکی لے کر اس کو دے دوں گا، یہ کہہ کر آپ ہنس پڑے، پوری مجلس ہنس پڑی، پھر آپ نے بڑی کشادہ دلی سے فرمایا کہ کوئی بات نہیں، معاف ہے۔

(ایک دوسرا لطیفہ) یہ میرے صاحب زادے ہیں

ایک مرتبہ مجلس میں ایک صاحب تشریف لائے، ان کا بچہ دارالعلوم دیوبند میں پڑھتا تھا، اپنے اس بچے کو بھی ساتھ لائے تھے، جب حضرت نے ان سے تعارف چاہا، تو انھوں نے اپنا نام وغیرہ بتانے کے بعد کہا کہ (اپنے بچے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) یہ میرے ''صاحب زادے'' ہیں، دارالعلوم میں پڑھتے ہیں، ملاقات کی غرض سے آیا ہوں، آپ نے ظریفانہ انداز میں فرمایا کہ جب یہ ''صاحب زادے'' ہیں، تو آپ ''صاحب'' ہوئے، اس پر انھیں خفت محسوس ہونے لگی کہ ان کو کوئی دوسرا لفظ کہنا چاہیے تھا، اِس میں تو اپنی ہی بڑائی نکل آئی، ان صاحب کو ذرا شرمندہ دیکھ کر میں نے اُن کے دفاع میں عرض کیا کہ حضرت! بڑوں کی مجلس میں ذرا سنبھل کر بولنا چاہیے، اسی سنبھلنے کی کوشش میں بعض مرتبہ آدمی اور پھنس جاتا ہے اور زبان قابو میں نہیں رہ پاتی، کچھ کا کچھ نکل جاتا ہے، اس پر آپ ہنس پڑے اور پھر وہ صاحب بھی خوش ہو کر بیٹھ گئے۔

تالیف پر اجرت کیوں لوں؟

حضرت الاستاذ کی تدریسی خدمات کا دورانیہ مجموعی طور پر تقریباً چھ دہائیوں پر محیط ہے، تقریباً ساٹھ سال کے اس طویل تدریسی خدمات کے عرصے میں آپ نے اس کے عوض میں ایک روپیہ تک نہیں لیا، (شروع میں راندیر، گجرات یا دارالعلوم میں آپ نے جو تنخواہ لی تھی، اسے مکمل طور پر لکھ رہے تھے، وسعت ہوتے ہی آپ نے وہ سب بھی دونوں اداروں کو واپس فرما دیا تھا) حضرت والا

کے اس عمل کا علم تقریباً تمام لوگوں کو ہے کہ آپ نے تدریس کی کبھی بھی تن خواہ نہیں لی؛ مگر ایک واقعہ جو آپ نے سنایا تھا، وہ یہاں عرض کرنا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ آپ نے فرمایا کہ پاکستان کے ایک کتب خانے والے نے مجھ سے ''رحمۃ اللہ الواسعۃ'' کے چھاپنے کا معاملہ (تقریباً) ڈیڑھ لاکھ میں کیا، وہ رقم بھی میرے پاس آ گئی، پھر اچانک خیال ہوا کہ جب میں تدریس کا پیسا نہیں لیتا ہوں، تو تالیف کا کیوں لوں؟ چناں چہ میں نے مکتبے والے کو فون کیا کہ آپ کتابیں یوں ہی چھاپیں، مجھے پیسے نہیں چاہئیں؛ مگر رقم چوں کہ آ گئی تھی، اس لیے انھیں واپس کرنا تھا، اس کا طریقہ مکتبے والے نے یہ بتایا کہ دارالعلوم کے ایک دوسرے استاذ حضرت علامہ جمال صاحب رحمہ اللہ (یہ بھی اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں، اللہ پاک درجات بلند فرمائے، آمین) سے بھی میرا کچھ کتابیں چھاپنے کا معاملہ ہوا ہے؛ لہٰذا یہ رقم آپ ان کو دے دیں؛ چناں چہ آپ نے وہ پوری رقم حضرت علامہ جمال صاحب رحمہ اللہ کو اس مکتبے والے کی جانب سے پہنچا دی اور اس طرح آپ نے ساری زندگی جس طرح تدریس پر کوئی معاوضہ نہیں لیا، تالیف پر بھی نہیں لیا۔

حضرت علامہ بلیاوی رحمہ اللہ کی نصیحتوں پر جی جان سے عمل

حضرت الاستاذ نے فرمایا کہ جب میرے استاذ حضرت علامہ ابراہیم صاحب بلیاوی قدس سرہٗ مجھے ''راندیر'' کے لیے رخصت کر رہے تھے، تو خاص رخصت کے وقت آپ نے تین نصیحتیں فرمائی اور تینوں کی حکمت بھی بیان فرمائی:

پہلی نصیحت: ''مولوی صاحب! فن دیکھ کر پڑھانا، شرحیں دیکھ کر مت پڑھانا، علم آئے گا''۔

دوسری نصیحت: ''اور طلبہ کو اپنی اولاد سمجھنا، وہ تم سے محبت کریں گے''۔

تیسری نصیحت: اور سنت کی پیروی کرنا، لوگوں کے دلوں میں وقعت پیدا ہوگی''۔

(تحفۃ الالمعی: ۱۱۳/۵)

اپنے استاذِ گرامی کی ان تینوں نصیحتوں پر آپ نے اس مضبوطی سے عمل کیا کہ اس کی مثال اگر ناممکن نہیں، تو مشکل ضرور ہے اور نصیحت پر عمل کے نتیجے میں تینوں چیزیں، آپ کو کس درجے میں حاصل ہوئیں، اس کے بھی ذکر کی ضرورت نہیں، آپ خود فرماتے ہیں: ''**یہ تین باتیں میرے لیے کس قدر مفید ثابت ہوئیں؛ یہ میں بیان نہیں کر سکتا**''۔ (تحفۃ الالمعی: ۱۱۳/۵)

آپ کے علم کا کیا تذکرہ کیا جائے، بس مختصر یہ کہ عوام کا تو تذکرہ ہی کیا، خواص سے بھی خواص کی مجلس میں جب آپ تشریف فرما ہوتے، تو ان کے درمیان بھی آپ ہی کی علمی جلالتِ شان بالکل نمایاں ہوتی، آپ کا علمی تفوق ظاہر ہو رہا ہوتا، کسی ایک فن میں نہیں؛ بل کہ جس فن میں گفتگو فرماتے، اس کے امام معلوم ہوتے، بہ قول میرے رفیق محمود لبنانی کے: ''آپ جب گفتگو شروع فرماتے ہیں، تو ایسا لگتا ہے کہ ایک دریا ہے، جو چل پڑا ہے''۔

آپ کو جو دنیا جہان میں عزت ملی، کیا وہ کسی سے مخفی ہے،؟ راقم نے تو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ ڈھائی ڈھائی تین تین سال کے بچے تک بھی آپ کو سلام کرتے تھے، بڑے سے بڑے مال دار آپ کے سامنے احتراماً جھک جاتے تھے، بعض مال داروں کو تو راقم نے خود دیکھا کہ اپنے گھر میں قیام کی درخواست پیش کرتے اور قبول ہو جانے پر بچوں کی طرح بھاگ بھاگ کر خدمت کرتے۔

اور طلبہ کی محبت کا عالم میں کیا بیان کروں کہ اب تک جب کہ یہ تحریر لکھتے ہوئے آپ کی وفات کو تیرہ دن ہو چکے ہیں؛ مگر ان کے آنسو اب بھی تھمنے کا نام نہیں لے رہے ہیں، یہ ایک حقیقت ہے، ایک مثال بھی لگے ہاتھ ملاحظہ فرمالیں:

طلبہ کی آپ سے محبت کی ایک مثال

حضرت الاستاذ نے اپنے استاذ حضرت علامہ بلیاوی رحمہ اللہ کی مذکورہ تینوں نصیحتوں پر مضبوطی سے عمل کیا اور ہر عمل پر سوفی صد نتیجہ سامنے تھا، جیسا کہ مذکور ہوا یہاں پر ایک نصیحت: ''اور طلبہ کو اپنی

اولاد سمجھنا، وہ تم سے محبت کریں گے'' کی ایک مثال عرض کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے:

حضرت الاستاذ کی وفات کے تقریباً پندرہ دن بعد راقم نے اپنے استاذِ محترم: حضرت اقدس مولانا مفتی عبداللہ صاحب معروفی (استاذ تخصص فی الحدیث دارالعلوم دیوبند) کو کسی ضرورت سے فون کیا، دورانِ گفتگو حضرت الاستاذ نوراللہ مرقدہٗ کا ذکرِ خیر چل پڑا، باتوں باتوں میں حضرت کی زبان سے نکل گیا کہ آپ کی وفات کی خبر کے بعد تو آنسو رک ہی نہیں رہے تھے اور پھر فرمایا کہ اللہ نے ایسے مہینے میں حضرت کو اپنے پاس بلایا کہ رمضان المبارک کے اخیر عشرے کی عبادتوں کا ثواب خوب اُن کے حصے میں آیا اور نہایت تواضع کے ساتھ آپ نے فرمایا کہ میں کیا کہوں، ہم جیسے کم زوروں کو بھی اللہ نے یہ توفیق دی کہ پچیس رمضان کو آپ کی وفات ہوئی، اس دن سے تیس رمضان المبارک تک مسلسل پانچ دن میں الحمدللہ پانچ ختم قرآن حضرت کے لیے کیا۔

اللہ اکبر! یہ آپ کے شاگردوں کی آپ سے محبت کی کتنی بڑی دلیل ہے کہ وفات کے بعد سب سے بہتر جو چیز ہو سکتی تھی، سب سے قیمتی جو سوغات ہو سکتی تھی، اس کا تحفہ آپ کو اپنے طلبہ کی طرف سے ملا اور خوب ملا۔

یہاں راقم کا اپنے ان بھائیوں کو ایک چھوٹا سا مشورہ ہے جو سن سنا کر، اِدھر اُدھر سے پوچھ پاچھ کر تقریباً ایک ہی طرح کی تحریر لکھ رہے ہیں، جس میں عامۃً حضرت کی زندگی کے ان ہی پہلوؤں کو لایا جا رہا ہے، جو بالکل نمایاں ہیں، کہ اگر وہ ایسی چیزوں میں وقت صرف کرنے کے بہ جائے، ان اوقات کو ایصالِ ثواب کے لیے استعمال کریں، تو یہ حضرت الاستاذ کی روح کے لیے زیادہ خوشی کا باعث ہو، باقی تفصیلی سوانح تو حضرت الاستاذ مفتی محمد امین صاحب دامت برکاتہم تیار فرما ہی رہے ہیں، انتظار کیا جائے۔

پدرانہ خیر خواہی

ایک مرتبہ حضرت الاستاذ کی مجلس میں حضرت مولانا سلمان صاحب بجنوری، حضرت مولانا

خضر صاحب کشمیری، حضرت مولانا منیر احمد صاحب گڈاوی دامت برکاتہم (اساتذۂ دارالعلوم دیوبند) تشریف لائے، تینوں سفید لباس میں ملبوس تھے، سروں پر خوبصورت عمامہ سجا ہوا تھا، چہرے بالکل چاند کی طرح چمک رہے تھے (جیسا کہ تہجد کی پابندی کی وجہ سے تقریباً تمام ہی اساتذہ دارالعلوم کا چہرہ بالکل منور نظر آتا ہے اور آج بھی الحمدللہ یہ حضرات "**رهبان بالليل فرسان بالنهار**" کی کافی حد تک عملی تصویر بنے ہوئے ہیں)، مجلس میں موجود ہم طلبہ کا جی بار بار اُن حضرات کو دیکھنے کو چاہ رہا تھا، اس پر مزید حضرت مولانا سلمان صاحب اور حضرت مولانا خضر صاحب کی پیاری پیاری محبت بھری خوب صورت باتیں، جو زبان کی صفائی اور الفاظ کی عمدگی کی وجہ سے مزید عمدہ ہو رہی تھیں، ایسا لگ رہا تھا کہ بالکل موتی بکھیر رہے ہیں، مجلس بالکل شباب پر تھی، حضرت الاستاذ بھی اپنی اِن اولاد کی محبت بھری حاضری اور پیار بھری باتوں کو سن کر پوری طرح کُھل چکے تھے، علم ومعرفت کا دریا جاری ہو چکا تھا، بارش کے قطرے کی طرح آپ ہم پیاسوں کو سیراب کر رہے تھے؛ تا آں کہ اللہ کے گھر کے منادی نے آواز دی اور مجلس نہایت ہی خوش گواری کے ساتھ اپنی انتہا کو پہنچی، جب یہ اساتذۂ کرام مجلس کے اختتام پر اٹھنے لگے، تو آپ نے ایک شفیق باپ کی طرح رخصت کرتے ہوئے فرمایا کہ "آپ تینوں حضرات بالکل اس طرح ہمہ وقت ساتھ نہ رہا کریں"۔

اللہ اکبر! کیسی خیر خواہانہ نصیحت تھی کہ کہیں میرے اِن ہیروں کو کسی کی نظر نہ لگ جائے، جیسے ہی حضرت مولانا سلمان صاحب بجنوری آپ کی بیٹھک سے باہر نکلے، اپنے دونوں ساتھیوں سے عجیب کیفیت کے ساتھ بار بار کہہ رہے تھے کہ نہایت ہی حکیمانہ مشورہ ہے، نہایت ہی حکیمانہ مشورہ ہے!!

یقیناً حضرت الاستاذ کا یہ ایک حکمت بھرا مشورہ تھا جو آیت شریفہ:

﴿وَقَالَ يٰبَنِيَّ لَا تَدْخُلُوْا مِنْۢ بَابٍ وَّاحِدٍ وَّادْخُلُوْا مِنْ اَبْوَابٍ مُّتَفَرِّقَةٍ.﴾ (یُوسُف:٦٧)

(اور کہا میرے بچو! ایک دروازے سے داخل مت ہونا؛ بل کہ مختلف دروازوں سے داخل ہونا۔)

کے تناظر میں تھا، جسے اِن اساتذہ کی جماعت نے فوراً سمجھ لیا۔

مَرا ہاتھی بھی لاکھوں کا

اس بات سے تو کسی کو بھی انکار نہیں کہ یہ انحطاط کا دور ہے اور ہر شعبے، ہر جماعت اور ہر ادارے میں کم زوری آئی ہے؛ مگر یہ بات پورے وثوق، امانت داری اور شرحِ صدر کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ اس دورِ انحطاط میں بھی دارالعلوم دیوبند اپنے اسلاف کی صالح روایات کا سب سے بڑا محافظ و پاس دار ہے؛ چناں چہ ایک مرتبہ دارالعلوم کے متعلق ایسے ہی کسی انحطاط کی بات آئی، تو آپ نے فوراً کلام کا رخ پھیرتے ہوئے دارالعلوم کی شان میں فرمایا کہ ''مرا ہاتھی بھی لاکھوں کا''۔

ایک منفرد چَراغ

اردو زبان کا مشہور محاورہ ہے ''چَراغ تلے اندھیرا'' تجربات اور مشاہدات کی دنیا نے کافی حد تک اسے بالکل درست اور سچ کر دکھایا ہے، عموماً دیکھا یہ جاتا ہے کہ بڑوں کے پاس دور دور سے تشنگانِ علوم و معرفت آتے ہیں اور سیراب ہوکر لوٹتے ہیں؛ مگر جو قریبی ہوتے ہیں، وہ اکثر و بیشتر اپنی بے توجہی اور لاپرواہی کی بنا پر جوں کے توں رہ جاتے ہیں؛ مگر یہ چَراغ ایسا منفرد تھا، جس کے تلے اندھیرا بالکل نہیں تھا، اس کی روشنی سے جس طرح دور والے مستفید ہو رہے تھے، بالکل اسی طرح؛ بل کہ اس سے بھی زیادہ یہ اپنے قریب والوں کو منور کیے ہوئے تھا، آپ کے برادرِ عزیز حضرت الاستاذ مولانا مفتی محمد امین صاحب پالن پوری (استاذِ حدیث دارالعلوم دیوبند)، حضرت مولانا مفتی خورشید انور صاحب گیاوی (ناظمِ تعلیمات دارالعلوم دیوبند)، حضرت مفتی محمد نعمان صاحب سیتاپوری (مفتی دارالعلوم دیوبند)، حضرت مفتی اشتیاق احمد صاحب دربھنگوی (استاذ دار العلوم دیوبند)، حضرت مولانا مفتی احمد صاحب خانپوری زید مجدہ (شیخ الحدیث جامعہ تعلیم الدین ڈابھیل، گجرات)، حضرت مولانا مفتی عبدالرؤف صاحب غزنوی افغانی (سابق استاذ دارالعلوم دیوبند)، حضرت مفتی شبیر احمد صاحب (مدرسہ قاسمیہ شاہی مرادآباد) جیسے اساطینِ علم و فضل اس کی

واضح ترین مثال ہیں، یہ وہ پروانے ہیں، جو ہمہ وقت (بالخصوص طالبِ علمی کے زمانے میں) اس شمع کے اِردگرد رہے اور خوب خوب استفادہ کیا۔

آپ کی سادگی

آپ نے اپنے اسلاف واکابر کو صرف مسلک کی حد تک نہیں؛ بل کہ زندگی کے تمام گوشوں میں پوری طرح اپنایا تھا، آپ کا طرزِ زندگی بالکل سادہ، اپنے بڑوں کی طرح تھا" **کل جدید لذیذ**" کی پُرفریب صدا آپ کو اپنے بڑوں کے طرز زندگی سے ہٹانے میں کسی بھی طرح کام یاب نہ ہوسکی، آپ اس جدیدیت کی تاریک شب میں بھی بالکل سادگی کا چَراغ تھامے اپنے اکابر کی نمایاں مثال تھے: لباس، کھانا، پینا، رہائش؛ یہ تمام چیزیں بالکل سادہ تھیں، ٹھاٹ، باٹ کا دور دور تک کوئی گزر بسر نہیں تھا، جب کہ وسائل کی دنیا میں آپ کے لیے کوئی تنگی نہیں تھی، بہ الفاظِ دیگر یہ درویشی اضطراری نہیں، اختیاری تھی؛ آپ نے اَبھی قریب میں اپنی اولاد کے لیے چند ایک مکان تعمیر کروایا تھا، جس کا جی چاہے دیکھ لے، ان شاء اللہ ایک ایسی چیز اس میں نظر نہیں آئے گی جسے ضرورت سے آگے بڑھ کر تزئین، آراستگی، گل کاری وغیرہ کا نام دیا جاسکے، جب کہ آج اصل مکان سے زیادہ بڑی بڑی رقمیں صرف ان چیزوں میں خرچ کردینے کا تقریباً ہر طبقے میں عام مزاج بن چکا ہے؛ بل کہ آپ یہ فرماتے بھی تھے کہ علما کو ٹھاٹ باٹ سے بچنا چاہیے اور اگر کسی کو اللہ نے سہولت اور فراخی دی ہے، تو یہ کیا ضروری ہے کہ ساری رقمیں انسان اپنے اوپر ہی خرچ کرڈالے، اگر اپنی ضرورت سے زیادہ ہے، تو دوسروں کا تعاون کرے، یہ بات صرف آپ کی زبانی حد تک نہیں تھی؛ بل کہ کہنے سے کہیں زیادہ آپ نے عمل کرکے بتایا، حضرت امام مالک رحمہ اللہ کا مشہور جملہ :"**لن يصلح آخر هذه الأمة إلا بما صلح به أولها**"، ہمہ وقت آپ کے پیشِ نظر ہوتا تھا، دنیا کی زندگی کی فنائیت حقیقتاً آپ کے عمل عمل سے بالکل نمایاں تھی۔

کیا عشق نے سمجھا ہے؟ کیا حسن نے جانا ہے؟
ہم خاک نشینوں کی ٹھوکر میں زمانہ ہے

ایک بہت ہی خاص بات

آپ نے اپنے قریب رہنے والے شاگردوں؛ بل کہ روحانی بیٹوں کے ساتھ جو ایک پدرانہ معاملہ کیا، اُسے بہتر سے بہتر طریقے پر تو صاحبِ معاملہ ہی جانتا اور سمجھتا ہے، بس اتنا اجمالاً عرض ہے کہ ہم قریبی طلبہ پر خصوصی طور پر آپ کے جو مختلف پہلوؤں سے احسانات ہیں، اس کی اگر ہم سب صرف فہرست ہی تیار کریں، تو شاید اچھی خاصی طویل ہو جائے؛ مگر اس اخلاص کے پیکر کا کتنا بڑا ظرف تھا، کیسی للّٰہیت ان کے اندر بھری ہوئی تھی، اپنے ہر نیک عمل کو کس طرح آخرت کے لیے بچانے کی ان کی عجیب وغریب قسم کی فکر تھی کہ کبھی بھی آپ اپنے ان عظیم احسانات کو اپنے قول وعمل سے ظاہر تو کیا کرتے، دور دور تک کبھی احساس تک نہیں ہونے دیا کہ انھوں نے ہم خوشہ چینوں پر اس قدر احسانات کے دریا بہائے ہیں!! گویا آپ آیتِ شریفہ ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَ الْاَذٰی﴾ [البقرۃ: ۲۶۴] (اے ایمان والو! اپنی نیکیوں کو احسان جتلا کر اور تکلیف دے کر ضائع نہ کرلو۔) کی بالکل عملی تفسیر تھے۔

خیر! اب ہم اپنے رب سے اپنے اس محسن کے لیے یہی دعا کرتے ہیں کہ: ان نیکیوں کے بدلے تمھیں فضل رب ملے۔

آپ کی ایک خاص عادتِ شریفہ

عام طور پر جلسے وغیرہ میں دیکھا جاتا ہے کہ مہمانِ خصوصی یا صدرِ جلسہ بالکل وقت پر یا ذرا پہلے اسٹیج پر جلوہ افروز ہوتے ہیں؛ مگر اس سلسلے میں بھی حضرت الاستاذ کا نمایاں طرزِ عمل یہ تھا، جسے ہم نے دیکھا بھی اور آپ ہی کی زبانی سنا بھی کہ میں جلسے میں ابتدا سے لے کر انتہا تک بیٹھنا پسند کرتا ہوں اور بیٹھتا ہوں، ”جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم“ میں بھی آپ ۱۴۴۰ھ رجب المرجب میں جب تشریف لائے، تو یہ چیز دیکھنے کو ملی کہ بار بار پوچھتے کہ جلسے کا وقت ہو گیا؟ جب میں نے عرض کیا کہ ابھی طلبہ تمہیدی پروگرام پیش کر رہے ہیں، تو آپ نے فرمایا کہ کمرے میں بیٹھے رہنے سے اچھا ہے کہ وہیں

چل کر بیٹھیں اور یہ کہہ کر بالکل تیار ہو گئے اور اسٹیج پر پہنچ گئے۔

مرضیٔ مولیٰ از ہمہ اولیٰ

صبر وشکر کتنی عظیم شئ ہے اور شریعت میں اس کی کتنی تاکید آئی ہے، اس سے خواص ہی نہیں؛ بل کہ کافی حد تک عوام بھی واقف ہیں؛ مگر عمل کا معاملہ بالکل برعکس ہے، صبر کے موقع پر بے صبری کا ظہور اور شکر کے موقع پر ناشکری کی فضا، عوام سے آگے بڑھ کر بسا اوقات خواص میں بھی دیکھنے کو مل جاتی ہے؛ مگر آپ کے اندر یہ دونوں وصف بالکل نمایاں تھے، دور طالبِ علمی سے لے کر تدریسی زمانے تک سخت سے سخت اور صبر آزما حالات کا آپ نے پوری خندہ پیشانی اور جذبۂ صبر وشکر کے ساتھ اس طرح مقابلہ کیا، گویا آپ بالکل صبر وشکر کے مجسمہ تھے۔

اس سلسلے کے بھی ایک دو نہیں، متعدد واقعات ہیں، اس وقت صرف ایک واقعہ ذکر کیا جاتا ہے، آج سے بارہ تیرہ سال پہلے جب آپ سے ''بخاری شریف'' کا سبق متعلق ہوا، اسی کے ایک دو سال بعد ہی سے آپ پر زبردست قسم کا سحر ہوا، جس سے اخیر عمر تک آپ نکل نہ سکے، پوری پوری رات تکلیف میں گزرتی، نیند بالکل نہ آتی، تکلیف سے کروٹیں بدلتے رہتے، اٹھ اٹھ کر اپنے آپ کو جھاڑتے، پھر لیٹتے، پھر پریشان ہو کر اٹھتے؛ مگر پوری ہمت کے ساتھ ایسی سخت قسم کی تکلیف کو برداشت کیے ہوئے تھے اور جب ہم قریب رہنے والے طلبہ یا اپنی اولاد کو اس حوالے سے پریشان دیکھتے تو بار بار تسلی کے لیے خود ہی فرماتے: ''مرضیٔ مولیٰ از ہمہ اولیٰ''؛ بل کہ آپ کی عادتِ شریفہ ہی صبر وشکر کی ایسی ہو گئی تھی کہ گویا آپ خود ہی ''زیــد عــدل'' کی طرح صبر وشکر بن گئے تھے، ہر قسم کی تکلیف کو سہتے؛ مگر زبان پر ہر حال میں شکر کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا۔

جب آپ کا بائی پاس ہوا، تو اس موقع پر دیکھنے والوں نے ممبئی میں بھی دیکھا اور پھر دیوبند واپسی پر جب طبیعت کچھ خراب ہو گئی اور دیوبند ہی میں ''اَنوج گویل'' نامی ڈاکٹر کے شفاخانے میں آپ کو رکھا گیا، تو اس راقم نے بہ ذاتِ خود دیکھا کہ جب بھی ڈاکٹر ''انوج گویل'' آپ کے معاینے کے

لیے آتے اور اپنے انداز میں پوچھتے کہ کیسے ہیں؟ سعید صاحب! تو آپ جیسے بھی ہوتے؛ مگر فوراً فرماتے کہ میں ٹھیک ہوں الحمدللہ! (میں ناکارہ اس وقت دل ہی دل میں سوچتا کہ اگر آپ اچھے ہیں، تو پھر اسپتال کیوں لایا گیا؟ یعنی میرا خیال یہ ہوتا کہ آپ کم سے کم ڈاکٹر کو تو کھل کر اپنی تکلیف بتائیں) ڈاکٹر سمجھتے کہ واقعی ٹھیک ہیں، خوش ہوکر چلے جاتے، بار بار کے ایسے جواب پر کسی قریبی تیماردار نے عرض کیا کہ حضرت آپ اس بیماری کے عالم میں بھی سب کو یہاں تک کہ ڈاکٹروں کو بھی یہی کہتے ہیں کہ میں ٹھیک ہوں، الحمدللہ! تو ڈاکٹر آپ کا پوری طرح علاج کیسے کریں گے؟ کم سے کم ڈاکٹروں کو تو تکلیف بتائیے، اس پر آپ خاموش تو ہو گئے؛ مگر محسوس ہوا کہ اس مجسمہ صبر وشکر کا اب بھی جواب وہی ہوگا، جو پہلے تھا۔

آئے دن محبت بڑھتی ہی چلی گئی

دنیا میں عام طور پر ایک بات یہ بھی دیکھی جاتی ہے کہ انسان جب تک کسی سے دور رہتا ہے، کافی حد تک اس کی محبت وعظمت دل میں باقی رہتی ہے؛ مگر جب قریب ہو جاتا ہے اور بہت سی چیزیں اس کی دیکھنے سننے کو ملتی ہیں، تو پھر ہوتے ہوتے محبت میں کمی آنے لگتی ہے؛ کیوں کہ اب قریب ہونے کی وجہ سے اصلی حالت کا پتہ چلتا ہے، مگر کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ ان سے ملنے اور ان کو قریب سے دیکھنے کے بعد روز بہ روز محبت بڑھتی ہی چلی جاتی ہے، آپ کی شخصیت کچھ ایسی ہی تھی، جوں جوں ہم آپ کے قریب ہوتے گئے، توں توں آپ کی محبتوں میں اضافہ ہوتا گیا، ہوتا گیا۔

سنت پر پوری طرح عمل کرنے والوں کے متعلق یہی چیز دیکھنے کو ملتی ہے کہ ان سے قریب ہونے والے قریب تر ہو جاتے ہیں۔

آپ ایک حقیقت پسند انسان تھے

بڑوں کے پاس بہت سی مرتبہ کنکھجوروں کی جماعت گھومتی رہتی ہے، جو نہایت ہی ہوشیار اور چالاک ہوتی ہے، بڑی بڑی شخصیتوں کو اپنی مرضی پر چلنے پر مجبور کر دیتی ہے، اپنے ہر مقصد کو کسی نہ کسی

چالاکی سے پورا کروالیتی اور ہر مطالبے کو منوالیتی ہے، اگر کسی کے متعلق اُنھیں ذرا بھی شبہ ہو جائے کہ یہ کل کو کچھ نمایاں ہوسکتا ہے، تو فوراً بلا خوفِ خدا اُس کو ٹھکانے لگانے کی فکر میں لگ جاتی اور عموماً لگا کر ہی چین لیتی ہے؛ (لیکن ایسوں کو یاد رکھنا چاہیے کہ یہ دنیا اور اس کی چیزیں ہمیشہ رہنے والی نہیں، آنکھ بند ہونے کے بعد اس شرارت اور دوسروں کے دل دکھانے کا انجام ضرور معلوم ہو جائے گا، بس ذرا صبر کریں)

وقت یکساں نہیں رہتا سن لے ظالم!
خود بھی رو پڑتے ہیں اوروں کو رلانے والے

حضرت الاستاذ کی شخصیت اس اعتبار سے بھی نہایت ہی متیقظ تھی، آپ اپنے قریبی شاگردوں پر شکرے کی نگاہ رکھتے تھے، آپ نے کبھی بھی ایسے بے کار قسم کے لوگوں کو اپنے قریب جمع نہیں ہونے دیا؛ بل کہ ایسوں سے ہمیشہ فاصلہ بنائے رکھا، آپ ایک حقیقت پسند انسان تھے، اپنے شاگردوں کے اندر کچھ صلاحیت اور اس سے بھی بڑھ کر سچی طلب اگر آپ دیکھ لیتے، تو فوراً اُن پر محنت شروع کر دیتے، انھیں بنانے سنوارنے کی مسلسل فکر کرتے؛ حتیٰ کہ اپنا قیمتی وقت دینے سے بھی بالکل گریز نہ کرتے، طالب علم کوئی بھی ہو، کہیں کا بھی ہو؛ یہی حقیقت پسندوں کی اولین ترجیح ہوتی ہے۔

''ہدایت القرآن'' لکھ کر مر جاؤں گا

موت تو ایک اٹل حقیقت ہے، اس سے کسے انکار ہے، بس بات اتنی ہے کہ اللہ پاک نے اپنی خاص حکمتوں اور مصلحتوں سے اس کے وقت کو، اس کے مکان کو چھپا رکھا ہے۔

اسی طرح یہ بات بھی مسلم ہے کہ موت سے انسان؛ بل کہ تمام ہی جان دار خائف رہتے ہیں؛ مگر اللہ کے کچھ بندے ایسے ہوتے ہیں کہ وہ اپنی زندگی اس طرح گزار رہے ہوتے ہیں کہ انھیں کسی بھی وقت موت کا کوئی خوف نہیں ہوتا، وہ ہمہ وقت موت کو گلے لگانے کے لیے بالکل تیار رہتے ہیں، اسی طرح وہ دنیا میں بے کار رہ کر جینے کو بھی پسند نہیں کرتے، حضرت الاستاذ کی شخصیت یقیناً کچھ ایسی

ہی تھی، کبھی بھی آپ موت سے گھبراتے نہیں تھے، کسی کے بھی انتقال کی خبر ملتی، پہلے مغفرت کی دعا فرماتے اس کے بعد فرماتے کہ جانا تو سب کو یقیناً وہیں ہے، آج وہ گئے کل ہم جائیں گے۔

آپ کی درجنوں قیمتی تصانیف میں ''ہدایت القرآن'' کو خاص خصوصیت حاصل ہے اور آپ کو بھی اس سے بڑا لگاؤ تھا، اس تفسیر کا کام بہت پہلے شروع ہوا؛ مگر عمر کے بالکل آخری حصے میں جا کر مکمل ہوا، جو آپ چاہ رہے تھے، ''رحمۃ اللہ الواسعۃ'' پانچ ضخیم جلدوں میں، اس کے بعد ''تحفۃ الالمعی'' آٹھ ضخیم جلدوں میں، اس کے بعد ''تحفۃ القاری'' بارہ ضخیم جلدوں میں جب مکمل ہوئی، تو آپ نے فرمایا کہ زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں؛ لہٰذا ''ہدایت القرآن'' کا کام فوراً شروع ہونا چاہیے، شروع ہوگیا، اسی وقت سے متعدد مرتبہ آپ کی زبان مبارک سے یہ جملہ سننے کو ملتا تھا کہ زندگی کا آخری کام ''ہدایت القرآن'' کو بناؤں گا، ''ہدایت القرآن'' لکھ کر مر جاؤں گا، پھر زندہ رہنے کی ضرورت نہیں، اس کے بعد کچھ کام نہیں کرنا ہے، اللہ پاک کو نہ جانے یہ جملہ کتنا پیارا لگا کہ ''ہدایت القرآن'' کی تکمیل احسن طریقے پر ہونے کے بعد کوئی مستقل تصنیفی کام آپ کو انجام دینے کا موقع نہ ملا اور کریم رب نے اپنی کتاب کا کام مکمل کرا کرا اپنے پاس اس قیمتی سوغات کو لے کر بلا لیا اور آپ اس ''ہدایت القرآن'' کے تحفے کو لے کر اپنے رب کی بارگاہ میں پہنچ گئے، خدایا بے حد قبول فرما کر حضرت الاستاذ کو خوش کر دیجیے۔

''ہدایت القرآن'' سے متعلق خواب

جب ''ہدایت القرآن'' کی بات آ ہی گئی، تو اس کے متعلق خوش خبری کے دو خواب بھی ملاحظہ کیا جائے:

راقم نے دونوں خواب بہ راہِ راست آپ سے سنا ہے اور آپ نے دونوں خواب کو ''ہدایت القرآن'' کی پہلی جلد جو آپ نے لکھی ہے، (یہ وضاحت اس لیے کی گئی کہ پہلی جلد حضرت مولانا عثمان کاشف الہاشمی صاحب کی بھی ہے اور پہلے انھوں نے ہی لکھی ہے) اس کے شروع میں

ذکر کردیا ہے، راقم اسے بعینہٖ حضرت الاستاذ ہی کے الفاظ میں ''ہدایت القرآن'' ہی سے یہاں نقل کرر ہا ہے، یہ سوچ کر کہ ہر انسان ہر کتاب کو نہیں پڑھتا:

پہلا خواب:

''جس زمانے میں میں (یہ حضرت الاستاذ اپنے متعلق فرمارہے ہیں) خود وقفے وقفے سے تفسیر لکھتا تھا اور چھاپتا تھا: ایک سال فیملی کے ساتھ عید الاضحیٰ کی تعطیل میں وطن گیا اور مئو کے ایک طالب علم مولوی فیاض سلمہ کو مکان سونپ گیا، اب وہ بڑے عالم ہیں، وہ میری بیٹھک میں لیٹے تھے، انھوں نے خواب دیکھا: نبی ﷺ میری جگہ تشریف فرما ہیں، طلبہ آپ ﷺ کو گھیرے ہوئے ہیں، آپ نے طلبہ سے فرمایا: ''سعید سے کہنا...... پوری کرے''، ان کی آنکھ کھل گئی، وہ بھول گئے کون سی کتاب پوری کرنے کے لیے فرمایا تھا؛ مگر میں اس زمانے میں ''ہدایت القرآن'' کا کوئی پارہ لکھ رہا تھا۔''

دوسرا خواب:

''پھر ایک عرصے کے بعد سہارن پور سے کسی خاتون کا خط آیا، وہ لڑکیوں کا مدرسہ چلاتی ہیں، انھوں نے خواب میں نبی ﷺ کو دیکھا اور پوچھا کہ وہ طالبات کو کیا پڑھائیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''ہدایت القرآن'' پڑھاؤ۔''

(ہدایت القرآن: ۱/۲۶)

آپ کا سفرِ آخرت اور اس سے متعلق راقم کا خواب

سفرِ آخرت پر روانہ ہونے سے پہلے ایک مرتبہ آپ کو شدید بخار آیا، پھر افاقہ ہوگیا، اس کے بعد تقریباً تین دن آپ نے تھوڑی دیر بیان فرمایا، ان ایام میں راقم کی بھی بہ ذریعہ فون آپ سے بات ہوئی اور بڑی محبت کے ساتھ پہلے ہی کی طرح تمام احوال معلوم کرتے ہوئے گفتگو فرمائی، اس

کے ایک دو دن بعد پھر آپ بیمار ہوگئے، اس وقت دوبارہ ایک خاص جانچ کے لیے آپ کا سیمپل لیا گیا، اس کی رپورٹ آنے میں قدرے تاخیر ہوئی، خیر رپورٹ آئی، آپ کے صاحب زادے جناب حسن بھائی اور جناب عبداللہ بھائی سے چوں کہ میں مسلسل رابطے میں تھا؛ اس لیے جناب حسن بھائی نے بتایا کہ خاص جانچ کی رپورٹ مثبت ہے، عافیت کی دعا کریں، یہ بات آپ نے غالباً جمعہ کی شام میں بتائی، اسی وقت سے ایک طرح کی تشویش شروع ہوگئی، رات گزار کر ہفتے کی صبح کو فجر کے بعد جب میں لیٹا، تو خواب دیکھا کہ حضرت الاستاذ میرے گھر میں پلنگ پر تشریف فرما ہیں، میں (راقم السطور) اور ''جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم'' کے ''تکبیرِ مسلسل'' کی تزئین وسیٹنگ کا کام انجام دینے والے: مولانا مامون رشید صاحب قاسمی آپ کے قدموں میں نیچے بیٹھے ہیں اور امی جان (حضرت کی اہلیۂ محترمہ) شیرینی کی طرح کی کوئی مٹھائی ایک بڑی پلیٹ میں رکھ کر تقسیم کر رہی ہیں، جب آنکھ کھلی تو گھبراہٹ کی کیفیت تھی، میں نے فوراً اہلیہ سے کہا کہ کل حضرت کی رپورٹ آئی ہے، اچھی نہیں ہے اور ابھی میں نے ایسا ایسا خواب دیکھا ہے، جیسے ہی میں نے یہ خواب انھیں سنایا، سن کر فوراً اہلیہ نے کہا کہ بہ خدا تقریباً یہی خواب میں نے بھی ابھی ہی دیکھا ہے (بس اس میں مولانا مامون صاحب کا تذکرہ نہیں تھا) خواب کی تعبیر تو مجھے آتی نہیں؛ مگر بغیر غور وفکر کے یہ بات قوت سے دل میں آنے لگی کہ امی جان کو خوشی ہو رہی ہے، وہ مٹھائیاں تقسیم کر رہی ہیں اور وہ تو اس دنیا میں نہیں ہیں؛ لہٰذا انھیں خوشی ہونا دلیل اس بات کی ہے کہ آپ ان کے پاس تشریف لے جا رہے ہیں؛ مگر اپنے آپ کو تسلی دینے کے لیے میں زبان سے بس یوں ہی گھر میں کہتا تھا کہ نہیں آپ کو شفا ہو جائے گی، اس کی خوشی ہے؛ مگر دل اس پر ایک لمحے کے لیے بھی مطمئن نہیں ہوتا تھا، بار بار دل میں بات آتی تھی کہ امی جان کو خوشی ہو رہی ہے، اس کا مطلب یہی ہے کہ آپ وہاں جا رہے ہیں، قدرت نے تین ہی دن بعد بروز منگل ۲۵ ؍رمضان المبارک ۱۴۴۱ھ مطابق ۱۹؍مئی ۲۰۲۰ء کو اس خواب کو بالکل سچ کر دکھایا اور وہ ہستی جو رات و دن مجھ پر مہربان تھی، آج مجھ سے روٹھ گئی تھی، وہ مجھ سے بات نہیں کر رہی تھی، آج میں حقیقتاً یتیم ہو چکا تھا، میرا خیال رکھنے والا کوئی نظر نہیں آ رہا تھا، زندگی بھر جو درد کا درماں

تھا، وہ پتہ نہیں کس کے سہارے چھوڑ کر چلا گیا، اب کون شفقت سے میرے سر پر ہاتھ پھیرے گا کون میری پریشانیوں کو سن کر تسلی دیگا اب کسے اپنا سمجھ کر اپنا دکھ درد سناؤں گا اور اب کون مجھ سے پیار بھرے لہجے میں پوچھے گا کہ کیسے ہو؟ اے اللہ ہم آپ کے فیصلے پر پوری طرح راضی ہیں، **رضیت بالله رباً وبالإسلام ديناً وبمحمد صلى الله عليه وسلم نبياً .**

اے اللہ! آپ حضرت الاستاذ کو اپنی خصوصی رحمتوں میں ڈھانپ لیجیے، اپنی شایانِ شان جنت الفردوس میں اعلیٰ ترین مقام نصیب فرمائیے، آپ کی جملہ خدمتوں کو شرف قبولیت عطا فرمائیے اور ہمیں ان کے حق میں صدقۂ جاریہ بنا دیجیے، آمین یارب العالمین۔

ہم درد کے ماروں کو کر صبر عطا مولیٰ
گئی ہم سے بچھڑ کر اب یہ شفقتِ پدرانہ

محمد مرشد عفا اللہ عنہ

۸/شوال المکرّم ۱۴۴۱ھ مطابق یکم/جون ۲۰۲۰ء
یوم الاثنین، بہ وقت: سہ پہر تین بجے،
بہ مقام: جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم، بنگلور

''کتاب کی تکمیل کے بعد بالکل اخیر مرحلے میں استاذِ محترم حضرت اقدس مولانا مفتی محمد امین صاحب پالن پوری دامت برکاتہم کا حضرت الاستاذ کے حوالے سے لکھا گیا مختصر سوانحی خاکہ سامنے آیا، ناشر اور راقم الحروف دونوں کی رائے ہوئی کہ اس مختصر اور جامع سوانحی خاکہ کو کتاب کے اخیر میں شامل کردیا جائے ان شاء اللہ قارئینِ کرام کے لیے مزید دل چسپی کا سامان ہوگا؛ لہٰذا یہ سوانحی خاکہ قارئین کی خدمت میں پیش ہے۔''

محمد مرشد عفا اللہ عنہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فقیہ النفس حضرت الاستاذ

حضرت اقدس مولانا مفتی **سعید احمد صاحب پالن پوری** نور اللہ مرقدہ

(سابق شیخ الحدیث وصدر المدرسین دار العلوم دیوبند)

کا مختصر تعارف

اسم گرامی مع ولدیت: سعید احمد بن یوسف بن علی پالن پوری ثم دیوبندی حنفی۔

جائے ولادت: کالیڑہ ضلع بناس کانٹھا (شمالی گجرات) انڈیا۔

تاریخِ ولادت: (محفوظ نہیں، اندازاً) ۱۳۶۰ھ=۱۹۴۰ء۔

آبائی وطن: ڈبھاڈ گاؤں کی نئی بستی، مجاہد پورہ، ضلع: مہسانہ (شمالی گجرات) انڈیا۔

مستقل رہائش گاہ: محلّہ اندرون کوٹلہ دیوبند، ضلع: سہارن پور (یو، پی) انڈیا۔

تعلیم: اردو دینیات اور ناظرہ کلام پاک کی تعلیم ’’کالیڑہ‘‘ کے مکتب میں حاصل کی، فارسی کی ابتدائی تعلیم ۶/ ماہ دار العلوم چھاپی میں مختلف اساتذہ سے اور ۶/ ماہ اپنے ماموں مولانا عبد الرحمٰن شَیرا سے حاصل کی، فارسی کی بقیہ اور عربی کی ابتدائی تعلیم شرح جامی تک مصلح امت حضرت مولانا محمد نذیر میاں صاحب رحمہ اللہ کے ’’مدرسہ اسلامیہ عربیہ پالن پور‘‘ میں داخل ہو کر مختلف اساتذہ سے حاصل کی۔

شوال ۱۳۷۶ھ میں مظاہر علوم سہارن پور (یو، پی) میں داخلہ لے کر عربی متوسطات اور منطق وفلسفہ کی تعلیم حاصل کی، پھر شوال ۱۳۷۹ھ میں دار العلوم دیوبند میں داخل ہو کر عربی کی اعلیٰ تعلیم

حاصل کی، اور ۱۳۸۲ھ میں دورۂ حدیث پڑھا اور دورۂ حدیث کے سالانہ امتحان میں اول نمبر سے کامیابی حاصل کی، شوال ۱۳۸۲ھ میں تکمیلِ افتاء میں داخلہ لیا، اسی سال شیخ محمود عبدالوہاب محمود مصری کے پاس حفظ قرآنِ کریم کا آغاز فرمایا اور اگلے سال شیخ طریقت حضرت مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی رحمہ اللہ کے ہاتھ پر بیعت کی، اسی سال اربابِ انتظام نے فتوی نویسی کے لیے معاون مفتی کی حیثیت سے تقرر فرمایا، سال کے اخیر میں بعض کرم فرماؤں کی حرکت سے مستقل تقرر نہ ہوسکا، تو حضرت علامہ محمد ابراہیم بلیاوی رحمہ اللہ کے توسط سے ''دارالعلوم اشرفیہ، راندیر، سورت'' میں درجۂ علیا میں مدرس کی حیثیت سے تقرر ہوا۔

تدریس: شوال ۱۳۸۴ھ سے شعبان ۱۳۹۳ھ نو (۹) سال تک دارالعلوم اشرفیہ راندیر (سورت) میں درجۂ علیا کی کتابیں پڑھائیں، شعبان ۱۳۹۳ھ میں دارالعلوم دیوبند میں آپ کا درجۂ وسطی الف میں تقرر ہوا، شوال ۱۳۹۳ھ میں آپ دارالعلوم دیوبند تشریف لائے اور ذی قعدہ ۱۳۹۳ھ میں دار العلوم دیوبند میں درس وتدریس کا آغاز فرمایا اور دارالعلوم کی مسجدِ قدیم میں حضرت نانوتوی قدس سرہٗ کی ''آبِ حیات'' وغیرہ کتابوں کی تعلیم کی ابتدا فرمائی اور رحلت تک ۴۸ سال دارالعلوم دیوبند میں درس وتدریس کی خدمت انجام دیتے رہے۔

دیگر خدمات: ۱۳۹۵ھ اور ۱۴۰۲ھ میں دارالافتاء کی نگرانی اور فتوی نویسی کی خدمات بھی انجام دیں، جب دارالعلوم دیوبند میں ''مجلس تحفظ ختم نبوت'' کا قیام عمل میں آیا، آپ اس کے ناظمِ اعلیٰ مقرر کیے گئے اور رحلت تک اس عہدے پر فائز رہے، مذکورہ بالا خدمات کے علاوہ حضرت مہتمم صاحب دارالعلوم دیوبند نے جو تحریری اور تقریری خدمت سپرد فرمائی، اس کو بہ حسن وخوبی انجام دیتے رہے اور طویل مدت تک دارالعلوم دیوبند کی مؤقر مجلسِ تعلیمی کے اہم رکن رہے، شعبان ۱۴۲۹ھ میں مجلسِ شوری نے شیخ الحدیث کے منصب کے ساتھ صدر المدرسین کے عہدۂ جلیلہ کے لیے بھی منتخب فرمایا، وفات تک آپ ان دونوں جلیل القدر عہدوں پر فائز رہے۔

تصانیف: آپ کی تصنیفات وتالیفات جواب تک طبع ہوچکی ہیں، ان کی تعداد پچاس (۵۰) ہے، اورجن کتابوں کی آپ نے اصلاح اورنظرِ ثانی فرمائی ہے، ان کی تعداد میری معلومات کے مطابق سترہ (۱۷) ہے، تفصیل ''حیاتِ سعید'' میں ملاحظہ فرمائیں۔

صدرجمہوریہ ایوارڈ: مذکورہ بالا علمی خدمات اور تصنیفات وتالیفات کی بنا پر موصوف کو بھارت سرکار نے ''صدرجمہوریہ ایوارڈ'' سے نوازا تھا؛ مگر موصوف اس کو وصول کرنے کے لیے اس لیے نہیں گئے کہ وہاں جائیں گے، تو تصویرکشی ہوگی اور میڈیا اس کی خوب تشہیر کرے گا، جب بار بار فون آتا رہا، تو موصوف نے دوسال کے بعد اپنے صاحب زادے: مولانا مفتی حسین احمد صاحب کو بھیجا اور اُنھوں نے ایوارڈ اورانعام وصول کیا۔

تنخواہ کی واپسی: اور خاص بات یہ ہے کہ آپ نے ۱۴۲۴ھ میں دارالعلوم دیوبند سے تنخواہ لینا موقوف کردیا اور ۱۳۸۴ھ سے ۱۴۲۳ھ تک جو تنخواہ دارالعلوم اشرفیہ راندیرا اور دارالعلوم دیوبند سے لی تھی، اس کو واپس کردیا اور مرتے دم تک آپ نے کسی دینی خدمت کا معاوضہ قبول نہیں کیا۔

قرآنِ کریم سے شغف: اورخوبی کی بات یہ ہے کہ آپ نے فراغت کے بعد تکمیلِ افتاء اورفتوی نویسی کے ساتھ قرآنِ کریم حفظ کیا، راقم الحروف کو حفظ کرایا اور شادی کے بعد اہلیۂ محترمہ کو حافظہ بنایا اورمحترمہ کی بدولت اپنے گیارہ صاحب زادوں، دوصاحب زادیوں، مفتی رشید احمد مرحوم کے دونوں بیٹوں: (۱) حافظ مسیح اللہ (۲) اورحافظ سمیع اللہ اور پانچ بہوؤں کو حافظ قرآن بنایا، بقیہ بہوؤں کا حفظ قرآن باقی تھا کہ مرحومہ اللہ کو پیاری ہوگئیں۔

اسفار: مذکورہ بالا مصروفیات کے باوجود آپ ملک وبیرونِ ملک کے دورے کرتے رہتے تھے اور جوحضرات دینی باتیں سننے کے مشتاق تھے؛ اُن کو اپنی نوا سنجیوں سے نوازتے رہتے تھے؛ مگر ایامِ درس میں سفر نہیں کرتے تھے، آپ نے ہندوستان کے علاوہ افریقہ، امریکہ، کناڈا، برطانیہ، ترکی، بخارا وسمرقند، برما، بنگلہ دیش وغیرہ کے اسفار دین کی تبلیغ اور مسلکِ علمائے دیوبند کی حفاظت واشاعت کے

لیے کیے، آپ کے خطابات عوام وخواص سبھی بڑی دلچسپی سے سنتے تھے۔

زیارت حرمین شریفین: آٹھ مرتبہ حرمین شریفین کی زیارت نصیب ہوئی، چار بار حج اور چار بار عمرے کے لیے، پہلا عمرہ اہلیہ محترمہ کے ساتھ شعبان ۱۴۲۱ھ میں پچاس (۵۰) طواف کی فضیلت حاصل کرنے کے لیے کیا۔

اجازتِ بیعت وارشاد: موصوف جس طرح علوم ظاہری میں درک وکمال رکھتے تھے، اسی طرح علوم باطنی سے بھی بہرہ ور تھے، آپ طالب علمی کے زمانے سے شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب رحمہ اللہ سے بیعت تھے اور حضرت مولانا مفتی مظفر حسین صاحب مظاہری رحمہ اللہ کے مُجازِ بیعت وارشاد تھے، نیز شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی رحمہ اللہ کے خلیفہ: حضرت مولانا سید محمود صاحب پٹھیروی رحمہ اللہ کے واسطے سے بھی آپ مجازِ بیعت وارشاد تھے۔

وفات حسرت آیات: ۲۵/ رمضان المبارک ۱۴۴۱ھ مطابق ۱۹/ مئی ۲۰۲۰ء بروز منگل صبح ساڑھے چھ اور پونے سات کے درمیان روح پاک جسد عنصری سے پرواز کرگئی، انا للہ وانا الیہ راجعون، غسل اور کفن کے بعد نمازِ جنازہ موصوف کے صاحب زادے: حافظ مولوی وحید احمد صاحب نے پڑھائی، لاک ڈاؤن کے باوجود کافی لوگ نماز جنازہ میں شریک ہوئے، نمازِ جنازہ کے بعد جوگیشوری کے ''اوشیورہ مسلم قبرستان'' میں مسنون طریقے پر تدفین عمل میں آئی، اللہ تعالیٰ موصوف کی بال بال مغفرت فرمائیں اور ان کے درجات بلند فرمائیں۔ آمین یارب العالمین!

محمد امین پالن پوری

خادم حدیث وفقہ ومرتب فتاوی دارالعلوم دیوبند

۳/ ذی الحجہ ۱۴۴۱ھ مطابق ۲۵/ جولائی ۲۰۲۰ء بروز ہفتہ

....اِس کتاب کی سطر سطر سے جو عقیدت وگرویدگی مترشح ہوتی ، ممنونیّت کے جن جذبات کی عکاسی ہوتی ہے، اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ کتاب کا مُصَنِّف کس قدر اپنے شفقت شعار وخلوص پیشہ استاذ کا ممنونِ اِحسان ہے۔

اس کتاب کا مطالعہ نہ صرف طلبہ؛ بل کہ اساتذہ کے لیے بھی مفید ہے کہ دونوں کو اس سے یہ سبق ملے گا کہ طلبہ کو اِطاعت وسعادت کا نمونہ ہونا چاہیے اور اساتذہ کو شفقتِ پدری واِخلاصِ بزرگانہ کی مثال رہنا چاہیے۔

حضرت مولانا نورِ عالم خلیل صاحب امینی زیدمجدہ
(استاذ ادبِ عربی وچیف اڈیٹر "الداعی" دارالعلوم دیوبند)

.....میں نے پوری کتاب کو از اوّل تا آخر دیکھا ہے، کتاب اتنی دل چسپ اور معلومات افزا ہے کہ احقر نے ۳/ذی قعدہ ۱۴۴۱ھ کی شب میں عشاء کے بعد اس کو دیکھنا شروع کیا، پوری رات دیکھتا رہا اور فجر کی نماز ادا کرنے کے بعد پھر دیکھنا شروع کیا اور صبح آٹھ بجے اس کو مکمل کر کے الخ....

حضرت مولانا مفتی محمد امین صاحب پالن پوری دامت برکاتہم
(استاذ حدیث وفقہ دارالعلوم دیوبند)

....حضرت الاستاذ کے حوالے سے جو کچھ پیش نظر کتاب میں لکھا گیا ہے چوں کہ خود بندہ راقم الحروف کے ساتھ بھی حضرت الاستاذ کا برتاؤ اسی طرح کا رہا ہے، اس لیے اس ناچیز کو اس تحریر میں کوئی مبالغہ آرائی نظر نہیں آتی...

حضرت مولانا مفتی عبداللہ صاحب معروفی مدظلہ العالی
(استاذ شعبۂ تخصص فی الحدیث دارالعلوم دیوبند)

... یہ تحریر جامعہ مسیح العلوم بنگلور کے لائق وفائق استاذ: مولانا مفتی محمد مرشد صاحب زیدمجدہم نے ان کے علم میں موجود ذخیرے میں سے نکال کر جمع کیا ہے اور ان کو حق بھی تھا کہ وہ یہ کام انجام دیتے؛ کیوں کہ اُن کو حضرت مفتی صاحب سے جہاں تلمیذانہ تعلق تھا، وہیں ان کو مسترشدانہ تعلق بھی حاصل تھا؛....اندازہ ہوا کہ بڑی کام کی باتیں اس میں جمع کی گئی ہیں، جو ایک جانب علما اور طلبہ کے لیے بڑی نافع ہیں، تو دوسری جانب عوام کے لیے بھی ان میں درسِ نصیحت وعبرت موجود ہے۔

حضرت مولانا مفتی محمد شعیب اللہ خان صاحب مدظلہ العالی
(بانی ومہتمم وشیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم، بنگلور)

MAKTABAHIJAZ
NearQaziMasjidDeoband
Distt:Saharanpur(U.P)INDIA
Mobile:9997866990/9358914948